© rasailojaraid.com

تحقیق وتنقید

اسلامی ریاست میں بیت المال کی کارکردگی
(بینکنگ مشاغل کی روشنی میں)

ڈاکٹر ظفر الاسلام

دور حاضر کی معاشی سرگرمیوں میں بینکنگ نظام کو خاص عمل دخل حاصل ہے ۔موجودہ زمانہ میں بینکنگ مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ شاید ہی کوئی فرد اپنے کو ان سے الگ رکھ سکتا ہے ۔ کسان ہو یا تاجر، صنعت کار ہو یا مزدور، افسر ہو یا ملازم شہری ہو یا دیہاتی ہر شخص کو باہمی لین دین، نجی و سرکاری ضروریات کی تکمیل یا معاشی وسائل کی توسیع و ترقی کے لیے بینک کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔اس میں شبہ نہیں کہ بینکنگ نظام سے ہمیں باہمی لین دین، حکومت سے اقتصادی معاملات کے تصفیے، زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کے فروغ میں بڑی سہولتیں فراہم ہوتی ہیں لیکن اس کے ساتھ اس نظام کی وجہ سے ایک مخصوص طبقہ میں سرمایہ و دولت کا جو اکتناز ہوتا ہے اس کی خرابیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ موجودہ بینک معاشی فلاح و بہبود کے نام پر مختلف پیشہ کے لوگوں اور کمزور طبقوں کو مالی امداد بہم پہونچاتے ہیں لیکن اس کے عوض ان پر سود کی جو لعنت مسلط ہوتی ہے اس کی وجہ سے یہ "مالی اعانت" آخر کار ان کے لیے باعث زحمت بن جاتی ہے ۔یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بینکنگ سسٹم موجودہ دور کی دین نہیں بلکہ قدیم زمانہ میں بھی اس کی سیدھی سادی شکلیں اور آسان صورتیں پائی جاتی تھیں[1] اور یہ کہنا شاید مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ موجودہ بینکنگ نظام انھیں شکلوں سے گزر کر مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ایک ترقی یافتہ شکل اختیار کر چکا ہے ۔انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی تاریخ سے یہ واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ قدیم دور میں یونان، بابل و مصر کے لوگوں میں اور خود عربوں کے یہاں بینکنگ کی سادہ صورتیں رائج تھیں، تاجر و ساہوکار یا صراف اس نظام کے کل پرزے تھے اور قرض و امانت کے معاملات اور مختلف مقاصد کے لیے دور دراز مقامات تک ارسال زر کی خدمات انجام دیتے تھے، اس طرح انفرادی بنک کار کے روپ میں یہ بینکنگ مشاغل کو فروغ دیتے تھے ۔ظہور اسلام کے بعد جن ممالک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں ضروری ومناسب تبدیلی کے ساتھ بنک کاری کی یہ سادہ سی صورت باقی رہی اور جب اسلامی ریاست کی ترقی کے ساتھ انتظامی امور کو وسعت حاصل ہوئی بالخصوص شعبۂ مالیات کا دائرہ کافی بڑھ گیا تو حکومت کے زیرِ نگرانی بنک کاری کے مشاغل میں اضافہ ہوا بلا شبہ آج کل کی طرح اس دور میں حکومت کے قائم کردہ بڑے بڑے بینکنگ ادارے نہ تھے۔ لیکن تاریخی مآخذ سے اس بات کا قطعی ثبوت ملتا ہے کہ اسلامی ریاست کی سرپرستی میں بیت المال متعدد ایسے امور انجام دیتا تھا جو بدیہی طور پر بینکنگ اعمال کے زمرہ میں آتے ہیں، ذیل میں اسی پہلو سے بیت المال کی کارکردگی کا ایک مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

اسلام کے معاشی نظام میں بیت المال کی مرکزی حیثیت بالکل نمایاں ہے درحقیقت یہ ایک ایسے منظم مالی ادارہ کا نام ہے جس کے اردگرد اس کا پورا اقتصادی نظام گردش کرتاہے۔ دراصل اسلام کے تصور بیت المال میں ریاست کے وسائل آمدنی یا مسلمانوں کے اجتماعی اموال کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کی بہ نسبت انھیں متعینہ مصارف میں خرچ کرنا یا ان کے مستحقین تک پہونچا دینا زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہی اس نظم سے مطلوب ومقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ اموال اگر بیت المال کے خزانہ میں جمع کرنے کے بجائے براہِ راست ان کے مصرف میں خرچ کر دیے جائیں تو اس سے بیت المال کا مقصد ومنشا پورا ہو جاتا ہے۔ اس طرح بیت المال اصولی واصطلاحی طور پر محض خزانہ کے محفوظ مقام کا نام نہیں بلکہ اپنے وسیع مفہوم میں آمد وخرچ کے پورے نظام یا مالی ادارہ سے عبارت ہے۔ گرچہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ بیت المال کا قیام ریاست کے وسائل آمدنی کے جمع وتحفظ اور ان کے مصارف کی نگرانی کے لیے عمل میں آیا تھا لیکن تاریخی شواہد کی روشنی میں اس سے انکار مشکل ہے کہ نظم ونسق بالخصوص شعبۂ مالیات کی وسعت وترقی بیت المال کے مشاغل میں اضافہ کا باعث بنی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمد وخرچ کی نگرانی کی بنیادی ذمہ داری نبھانے کے ساتھ ساتھ بیت المال ریاست کی اقتصادی پالیسی کو بروئے کار لانے اور اس کے فلاحی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا ایک اہم وموثر ذریعہ بن گیا، حکومت کی انتظامی ضروریات کی تکمیل کا مسئلہ ہو یا فقراء ومساکین کی کفالت کا، امانت کا معاملہ ہو یا قرض کا، لاوارث جائداد کا سوال ہو یا اموال یتامیٰ کی نگہداشت کا، زراعت و تجارت کی ترقی مقصود ہو یا کمزور طبقے کے لوگوں کی معاشی فلاح وبہبود ایک مقام سے دوسرے مقام تک رقوم کی منتقلی کی ضرورت ہو یا سکوں کے تبادلہ واجراء کی دیکھ بھال کا مسئلہ ہو، یہ ادر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نوع کے دیگر امور کی انجام دہی بیت المال کی سرگرمیوں میں شامل ہوئی۔ ان میں سے متعدد امور آج بھی بینکنگ اعمال کا حصہ ہیں جیسا کہ ذیل کی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

سماجی تحفظ کا اہتمام

دور حاضر میں پسماندہ لوگوں اور معاشی اعتبار سے کمزور طبقوں کی مالی اعانت بینکنگ مشاغل میں شامل ہے، حکومت غریب، معذور اور محدود وسائل والے لوگوں کی معاشی ترقی کے لیے اسکیمیں تیار کرتی ہے اور انھیں بالعموم بینکوں کے ذریعہ بروئے کار لاتی ہے۔ اسی طرح حکومت بینکوں ہی کی وساطت سے کسانوں، تاجروں اور دوسرے اہل پیشہ کو مالی امداد فراہم کرتی ہے تاکہ وہ اپنے وسائل معاش کو وسعت و ترقی دیں اور دوسروں کے لیے بھی سامان معیشت فراہم کرسکیں، مزید براں بینک ان لوگوں کی آبادکاری کے لیے بھی وسائل مہیا کرتے ہیں جو ناگہانی مصائب یا آفات ارضی و سماوی کا شکار ہوکر اپنے تمام ذرائع آمدنی سے محروم ہوجاتے ہیں، یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ دور میں پسماندہ لوگوں اور معذور و محروم افراد کو بینکوں کے ذریعہ جو مالی اعانت فراہم کی جاتی ہے اس کی نوعیت زیادہ تر قرض کی ہوتی ہے اور اس کی واپسی سود کے ساتھ مشروط ہوتی ہے جس کی شرح قرض کی نوعیت اور مدتِ ادائیگی میں کمی بیشی کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس سیاق میں صدر اول کی اسلامی ریاستوں میں بیت المال کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ نادار و کمزور لوگوں کی معاشرتی کفالت یا سوشل سیکورٹی اس کی ذمہ داریوں کا سب سے اہم و نمایاں پہلو تھا اصولی طور پر بیت المال تمام افراد معاشرہ بالخصوص ان لوگوں کا کفیل ہوتا تھا جو مزمن مرض، ضعف پیری، نقص اعضا یا کسی اور عذر کی وجہ سے حصولِ معاش سے قاصر تھے یا جو معاشی جدوجہد کے باوجود محدود وسائل رکھتے تھے، درحقیقت ایک اسلامی ریاست میں یہ حکمراں کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ بیت المال کے وسائل سے غربا، و مساکین اور معذور افراد کی کفالت کا اہتمام کرے تاکہ وہ معاشرہ کے لیے بار نہ بننے پائیں۔ احادیث نبوی سے صاف طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ عوام کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اور نادار و معذور کی کفالت کا اہتمام سربراہ ریاست کا ایک اہم فریضہ ہے[۲۵]۔ جہاں تک غربا، و مساکین، معذور و مقروض اور عام اہلِ حاجات کا تعلق ہے بیت المال کے عارضی و مستقل دونوں قسم کے وسائل میں ان کے لیے مخصوص مد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجود ہے، اموالِ غنیمت، فیئ اور زکواۃ بیت المال کے وہ وسائل ہیں جن کے مصارف خود قرآن کے مقرر کردہ ہیں، مالِ غنیمت کے ضمن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ
(الانفال : ۴۱)

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

فیئ کے مصارف قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ
(حشر : ۷)

جو کچھ بھی اللہ ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

زکواۃ کے مصارف بیان کرتے ہوئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○
(توبہ : ۶۰)

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

ان تینوں کے مصارف میں جو شئ قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے وہ ہے سماج کے کمزور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طبقوں کی دستگیری اور اہل احتیاج کی حاجت روائی خمس غنائم اور فیئ کے مصارف میں یتامیٰ ومساکین اور مسافرین کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ زکوٰۃ وصدقات کے مصارف میں ان کے علاوہ غلاموں اور مقروضوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ رہے وہ وسائل جن کے مصارف امام یا امیر کی صوابدید پر موقوف ہوتے ہیں مثلاً خراج، جزیہ، عشور، لاوارث اموال ولقطہ، وہ ان کے ذریعہ انتظامی وفوجی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ انھیں مفاد عامہ اور اجتماعی فلاح وبہبود کے کاموں میں بھی خرچ کرسکتا ہے[۳۵] مزید براں فقہاء کی تصریح کے مطابق امام اس بات کا بھی مجاز ہوتا ہے کہ وہ عام مسلمانوں کی حاجت براری کے لیے خراج کی مد سے بوقت ضرورت رقم حاصل کرے اور یہ زکوٰۃ وصدقات کے شعبہ پر قرض نہیں ہوگا اس لیے کہ خراج کے مصارف بھی بہر حال اجتماعی فلاح وبہبود کے کام ہوتے ہیں[۳۶] جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بیت المال کے وسائل سے نادار ومعذور افراد کی کفالت اور اہلِ حاجات کی حاجت روائی کا معاملہ ہے اس کے لیے یہ ذکر کافی معلوم ہوتا ہے کہ وسائل کے محدود ہونے کی وجہ سے نہ تو بیت المال کی کوئی عمارت تھی اور نہ کوئی باقاعدہ نظم قائم تھا مالِ غنیمت، زکوٰۃ وصدقات کے طور پر جو کچھ آپ کی خدمت میں پیش ہوتا اسے آپ اسی وقت مسلمانوں میں تقسیم فرمادیتے اور خمس غنائم میں آپ کا جو حصہ ہوتا اسے بھی آپ اکثر مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی نذر کردیتے[۳۷] اس میں شبہ نہیں کہ یہ تقسیم عمومی ہوتی تھی لیکن احادیث نبویؐ سے اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس تقسیم میں "احتیاج وضرورت" کی خاص رعایت کرتے تھے، حضرت عوف بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جب فیئ کا مال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تو آپ اسی روز اسے تقسیم فرمادیتے اور شادی شدہ کو دو حصے اور مجرد کو ایک حصہ عطا فرماتے تھے[۳۸] اسی طرح سنہ ۴ھ میں بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد ان کے املاک واموال مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے مشورہ سے مہاجرین کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے یہ اموال صرف ان ہی میں تقسیم فرمائے، البتہ انصار میں سے سہیل بن حنیفؓ اور ابودجانہ سماک بن خرشہؓ کو ان کے فقر وفاقہ کی وجہ سے خصوصی طور سے اس میں سے کچھ عطا فرمایا[۳۹] اس امر پر کہ عہد نبوی میں بالفعل بیت المال موجود نہ تھا لیکن اس کے اعمال ومشاغل پائے جاتے تھے مزید شہادت اس سے پیش کی جاسکتی ہے کہ ریاست کی آمدنی میں اضافہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقروض متوفی کی جانب سے قرض کی ادائیگی کی ضمانت لیتے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس اصول کا اعلان فرمایا کہ "جو شخص قرض کی حالت میں وفات پا جائے اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی"[۸] ظاہر ہے کہ آپ کا یہ ارشاد صدر ریاست کی حیثیت سے اور اس سے مقصود یہ تھا کہ مذکورہ صورت میں قرض کی ادائیگی ریاست کے وسائل سے کی جائے گی اور یہ بخوبی معلوم ہے کہ بعد میں مقروضوں کی امداد و اعانت کے لیے بیت المال کی آمدنی کا ایک حصہ مخصوص قرار دیا گیا۔

عہد نبویؐ کے بعد خلفاء راشدین کے زمانہ میں بیت المال سے نادار و معذور ضعیف و بیمار اور یتیم و بیوہ کی کفالت کا نہ صرف یہ کہ دستور جاری رہا بلکہ ریاست کی توسیع و ترقی اور اس کے وسائل میں غیر معمولی اضافہ کے ساتھ اس کام میں مزید وسعت پیدا ہوئی، خلفاء راشدین میں حضرت عمرؓ کا زمانہ فتوحات کی کثرت وسائل کی فراوانی اور انتظامی امور کی توسیع کے لیے معروف ہے۔ انھوں نے بیت المال کے زیر نگرانی معاشی کفالت کا ایسا وسیع اہتمام کیا جس میں عربی و عجمی، شہری و دیہاتی، غلام و آزاد، مرد و عورت اور چھوٹے بڑے سبھی شریک تھے۔ اسی مقصد سے خلیفہ کے حکم سے چند تجربہ کار اشخاص نے مردم شماری کی اور عطایا یا وظائف کی تقسیم کے لیے "دیوان" نام کے ایک خصوصی شعبہ کا قیام عمل میں آیا[۹] تاریخ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عہد فاروقی میں بیت المال سے اس عمومی عطایا کی تقسیم کے علاوہ فقراء و اہل حاجات کی ایک علٰحدہ فہرست مرتب کی گئی اور ان کے لیے زکوٰۃ و صدقات اور عشور کی آمدنی سے مخصوص فنڈ فراہم کیا گیا[۱۰] حضرت عمرؓ کے عہد میں بیت المال سے عمومی عطایا و وظائف کا جو نظم کیا گیا اس سے اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے کہ بیت المال کے وسائل کی فراوانی کی صورت میں انتظامی ضروریات کی تکمیل اور مستحقین کے حقوق کی ادائیگی کے بعد جو کچھ آمدنی بچ رہتی تھی اس میں تمام لوگوں کو شریک کر کے ان کی معاشی ترقی کا اہتمام کیا جاتا تھا، یہ اور بات ہے کہ خلیفۂ وقت کی صوابدید کے مطابق تقسیم وسائل کے طریق میں اختلاف ہوتا تھا، ممکن ہے اس سے یہ شبہ پیدا ہو جیسا کہ حضرت عمرؓ کے اقدام کے وقت بھی بعض صحابہ نے ظاہر کیا تھا کہ بیت المال پر انحصار کی وجہ سے زراعت و تجارت اور معاش کے دوسرے ذرائع متاثر ہوں گے، اس وقت خلیفۂ وقت نے جو جواب دیا تھا وہ یقیناً قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ بیت المال میں مال فیئ کی کثرت ہے (فقال عمرؓ لابد من ھذا فقد کثر فیئ المسلمین)[۱۱] اس سے بظاہر یہی گوش گزار کرانا مقصود تھا کہ جملہ مصارف کی تکمیل کے بعد بھی بیت المال میں وسائل کی بہتات ہو تو اس سے بہتر اس کا مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے افراد امت پر ہی خرچ کیا جائے تاکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے اپنے وسائل معاش کے علاوہ یہ ذریعہ بھی ان کی آمدنی میں اضافہ کا سبب بن سکے۔

حضرت عمرؓ نے بیت المال کے وسائل سے عام مسلمانوں کی حاجت براری اور عطایا و وظائف کے ذریعہ سماجی تحفظ کا جو منظم طریقہ اختیار کیا تھا وہ بعد کے زمانہ میں بھی باقی رہا جیسا کہ ہمارے مآخذ اس کی شہادت پیش کرتے ہیں[۱۲] خلافتِ راشدہ کے علاوہ اموی و عباسی دور میں بھی غریب، معذور، ضعیف، بیمار، قرضدار، یتیم اور بیوہ کو بیت المال سے گزارہ ملنے کی مثالیں ملتی ہیں، بلاشبہ خلافت راشدہ کے بعد حکومت کے ڈھانچہ میں تبدیلی آئی اور حکمرانی کے طور طریق بدل گئے لیکن بیت المال سے معاشرہ کے کمزور و معذور افراد کی مالی امداد کے اصول میں کوئی فرق نہیں آیا، ممتاز اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (۷۱۷-۷۲۰ء) کو صدر ریاست کی حیثیت سے نادار و معذور اور بیکس و بے سہارا لوگوں کے حقوق کی تکمیل کا اس قدر احساس تھا کہ وہ اکثر اسے یاد کرکے آبدیدہ ہوجاتے اور قیامت میں محاسبہ کے خوف سے لرز جاتے[۱۳] انھوں نے اس ذمہ داری کی انجام دہی میں بیت المال کے وسائل کا بھرپور استعمال کیا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال اس ہدایت میں ملتی ہے جو انھوں نے شعبۂ مالیات کے افسر کو دی تھی کہ بیت المال سے مقروض افراد کو مالی امداد دی جائے تاکہ وہ اپنے بوجھ کو ہلکا کرسکیں[۱۴] ایک دوسرے اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک (۷۲۴-۷۴۳ء) کی بابت یہ صراحتہً مذکور ہے کہ ان کے عہد خلافت میں تمام ضعفاء و معذورین کا ریکارڈ مرتب کیا گیا تھا اور انھیں بیت المال سے اسی ریکارڈ کے مطابق وظیفہ ملتا تھا۔[۱۵] اسی طرح تیسرے عباسی خلیفہ المہدی کے بارے میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے ۷۷۹ء میں یہ حکم جاری کیا تھا کہ تمام قلمرو خلافت میں کوڑھ کے مریضوں اور قیدیوں کے لیے بیت المال سے روزینے عطا کیے جائیں[۱۶] یہاں یہ ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ عہد عباسی میں ان قیدیوں کی تجہیز و تکفین بھی بیت المال کے خرچ سے عمل میں آتی تھی جن کا کوئی وارث یا رشتہ دار باحیات نہیں ہوتا تھا۔[۱۷]

فقراء مساکین، معذور و بے سہارا اور مقروض کی کفالت کے علاوہ ان لوگوں کی آبادکاری بھی بیت المال کی سرگرمیوں کا ایک حصہ تھا جو ناگہانی مصائب یا آفات ارضی و سماوی کا شکار ہوکر پیسہ پیسہ کے محتاج ہوجاتے ہیں آج کل اسے بھی ایک اہم سماجی و معاشی مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے حل کے لیے بینکوں کی مختلف بچت اسکیموں یا انشورنس پالیسیوں کو مفید و موثر تصور کیا جاتا ہے۔ صدر اول کی اسلامی ریاستوں میں ایسے ناگہانی موقعوں پر بیت المال ایک بہترین سہارا ثابت ہوتا تھا اور مصیبت زدہ لوگوں کی پریشانیوں کو دور کرتا تھا جیسا کہ بخوبی معلوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ عہد فاروقی میں (۱۸ھ) ایک بار پورا حجاز سخت قحط کا شکار ہوا، اور اسی نسبت سے یہ سال "عام الرمادہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ لوگ فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دیہات کے لوگ وجہ معاش کی امید میں شہروں کا رخ کرنے لگے، خلیفہ وقت نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے مدینہ میں بیت المال سے نقد و اشیاء خوردنی کی تقسیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا اور اسی کے خرچ پر ہزاروں لوگوں کے لیے دونوں وقت کھانے کا اہتمام کیا، مرکزی بیت المال کے ذرائع اس ہنگامی ضرورت کے لیے ناکافی ہوئے تو انھوں نے مصر و شام اور دوسرے علاقوں سے غذائی اجناس منگوانے کا انتظام کیا اور اس طرح لوگوں کی ضروریات پوری کیں[۱۸]۔ مزید براں جب یمن کی بابت بھی حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع ملی کہ وہاں کے لوگ بھی قحط کے مصائب سے دوچار ہیں تو انھوں نے دو انصار کی نگرانی میں وہاں اونٹوں پر اجناس و کھجوریں روانہ کیں اور انھیں دونوں کے ذریعہ وہاں ان کی تقسیم کا اہتمام فرمایا[۱۹]۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دور میں بھی ایک بار حجاز کے لوگ خشک سالی کا شکار ہوئے۔ متاثرہ لوگوں کے ایک وفد کے ذریعہ جب خلیفہ کو اس صورتحال کی اطلاع ملی تو انھوں نے بیت المال سے مصیبت زدہ لوگوں کی مالی اعانت کی ہدایت جاری کی[۲۰]۔

اس نوع کے حادثات کے وقت بیت المال کی جانب سے مصیبت زدہ لوگوں کی دستگیری و آباد کاری کی مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس حقیقت کی روشنی میں کہ ہنگامی و اتفاقی حادثات میں لوگوں کی اعانت بیت المال کی ذمہ داریوں میں شامل تھی اس کی مزید ضرورت محسوس نہیں ہوتی، البتہ یہ ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناگہانی مصائب کے شکار لوگوں کو بالعموم فقراء و مساکین یا محتاجوں کے زمرہ میں شمار کر کے زکوٰۃ میں ان کا بھی حق تسلیم کیا جاتا ہے لیکن تابعین میں سے بعض جلیل القدر مفسر (مثلاً مجاہد) کی رائے کے مطابق زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں وہ لوگ بھی علیحدہ ایک گروپ کی حیثیت سے شامل ہیں جو اتفاقی و ناگہانی حادثات کا شکار ہوتے ہیں ان کی تصریح کے مطابق زکوٰۃ کے مخصوص مستحقین میں قرآن میں جو "غارم" کا ذکر ہے اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا مکان جل گیا ہو یا اس کا ساز و سامان سیلاب کی نذر ہو گیا ہو اور وہ اپنے اہل و عیال کی پرورش سے قاصر ہو، ایسے شخص کی ضروریات کی تکمیل یا اس کی کفالت بیت المال پر واجب ہے[۲۱]۔

لاوارث، گمنام و بے سہارا بچوں کی پرورش و پرداخت بھی ایک اہم مسئلہ ہے جو سماجی تحفظ یا اجتماعی کفالت کے زمرہ میں آتا ہے۔ دور حاضر میں حکومتیں ان کے لیے مخصوص ادارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ومراکز قائم کرتی ہیں اور اپنے وسائل سے ان کی پرورش و دیکھ ریکھ کا انتظام کرتی ہیں، اسلامی تاریخ کے بالکل ابتدائی دور ہی سے اس مسئلہ پر توجہ دی گئی اور ان بچوں کی پرورش و پرداخت کا اہتمام بیت المال کے سپرد ہوا۔ اس کے لیے کسی مخصوص مرکز یا ادارہ کے قیام کا ثبوت نہیں ملتا لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کے کھانے پینے، رہن سہن اور تربیت کے جملہ مصارف بیت المال سے پورے کیے جاتے تھے۔ ان کے لیے سرپرست (ولی) مقرر ہوتے تھے اور حکومت ان کی کارکردگی کا باقاعدہ احتساب کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ کی بابت مشہور ہے کہ جب بھی آپ کے پاس کوئی گمنام یا لاوارث بچہ لایا جاتا تو وہ ابتداءً اس کی رضاعت و پرورش کے لیے سو درہم مقرر کرتے اور اس کی عمر میں ترقی کے ساتھ اس کے گزارہ کی رقم میں اضافہ کرتے اور ساتھ ہی یہ حکم بھی فرماتے کہ اس کے دیگر اخراجات بھی بیت المال سے پورے کیے جائیں مزید براں امیرالمومنین کم از کم سال میں ایک بار اسے دیکھنے کے لیے جاتے، اس کے ولی سے تفتیش حال کرتے اور اس کے حق میں حسن سلوک کی ہدایت فرماتے۔[۲۲] حضرت علیؓ کے عہد میں بھی بیت المال سے گمنام ولاوارث بچوں کے گزارہ مقرر ہونے کا ثبوت ملتا ہے، بعد میں جب فقہاء عظام نے بیت المال کے مداخل ومصارف کی باقاعدہ ترتیب وتقسیم قائم کی تو بالصراحۃ غیر موروثہ اموال و املاک اور لقطہ کا ایک اہم مصرف لاوارث بچوں کی پرورش وپرداخت قرار دیا۔[۲۳]

یہاں یہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ اسلام کے عہد اول میں بیت المال کے نظم کے ذریعہ جس وسیع پیمانہ پر فقراء ومساکین، نادار ومعذور، بیمار و مقروض کی مالی اعانت اور ان کے و دیگر کمزور طبقہ کے لوگوں کے سماجی تحفظ کا اہتمام کیا گیا تھا اس سے ریاست کے غیر مسلم باشندے یا ذمی محروم نہیں تھے بلکہ جس طرح غربت و افلاس کا مارا، ناگہانی مصائب کا شکار یا ایک مفلوک الحال مسلمان کے لیے بیت المال سہارا بنتا تھا اسی طرح ایک غریب ونادار اور معذور ذمی کے لیے بھی بیت المال کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس کی ایک قطعی شہادت ممتاز فوجی جنرل حضرت خالد بن ولیدؓ اور اہل حیرہ کے مابین اس معاہدہ سے فراہم ہوتی ہے جو خلافت صدیقی میں انجام پذیر ہوا، اس معاہدہ کی ایک اہم دفعہ یہ تھی کہ اگر کوئی ذمی بوڑھا ہوجائے اور اس میں کام کرنے کی سکت باقی نہ رہے یا کسی آفت کے سبب وہ افلاس کا شکار ہوجائے یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب اسے خیرات وعطیہ دینے لگیں تو نہ صرف یہ کہ اس پر سے جزیہ ساقط کردیا جائے گا بلکہ اس کی اور اس کے اہل وعیال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی کفالت بیت المال کے ذمہ ہوگی۔[۲۴] حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ انھوں نے ایک بوڑھے ذمی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تو اسے گھر لے آئے اور کچھ عطا کیا۔ اس کے بعد بیت المال کے نگراں کو طلب کیا اور بوڑھے و کمزور ذمیوں کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ یہ سراسر ناانصافی ہوگی کہ جوانی کی حالت میں ذمیوں سے جزیہ وصول کیا جائے اور بڑھاپے میں انھیں بے سہارا چھوڑ دیا جائے۔[۲۵] مزید براں امام ابو یوسف کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی مردم شماری کرا کے بیت المال سے ان کے لیے عطایا و وظائف مقرر کیے اسی طرح ذمیوں میں سے ناداروں و ضرورت مندوں کے لیے بیت المال سے مالی اعانت کی فراہمی اور روزینہ جاری کرنے کا اہتمام کیا۔[۲۶] اس سے اہم یہ کہ حضرت عمرؓ زکوٰۃ و صدقات کے مصارف کی آیت "انما الصدقات للفقراء والمساکین" میں مساکین کا مصداق اہل کتاب کے غربا و ناداروں کو قرار دیتے تھے۔[۲۷] گرچہ اس مسئلہ میں فقہا متحد الخیال نہیں ہیں لیکن اس پر عام طور پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ صدقات واجبہ کے علاوہ بیت المال کے محاصل سے جس طرح مسلمانوں کی ضروریات وابستہ ہیں اسی طرح غیر مسلمین کی حاجات بھی ان سے پوری کی جا سکتی ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگی کہ امام اعظم و امام محمد کے قول کے مطابق زکوٰۃ و عشر کے علاوہ تمام صدقات واجبہ و نافلہ (مثلاً صدقہ فطر و نذر وغیرہ) ذمی فقراء کو دیئے جا سکتے ہیں۔[۲۸] اس کے علاوہ اسلام میں سماجی تحفظ کی فراہمی اور معاشرتی حقوق کی تکمیل میں مسلم و غیر مسلم میں عدم امتیاز کا ثبوت اس سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ فوج کی نقل و حرکت یا حکومت کے کسی دوسرے اقدام کی وجہ سے فصل کی تباہی کی صورت میں بیت المال ذمیوں کے نقصان کی تلافی کا بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔[۲۹] اسی طرح ایک ذمی کے مال چوری ہو جانے یا اس کے املاک کے تلف ہونے پر وہی قوانین نافذ ہوتے تھے جن پر ایک مسلم کی نسبت سے اس طرح کی صورت حال میں عمل کیا جاتا تھا۔[۳۰] واقعہ یہ ہے کہ فقراء و مساکین کی اعانت اور اہل حاجات کی حاجت روائی میں بیت المال مسلم و غیر مسلم کے مابین کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھتا تھا اور پھر جب اسلام میں صدر ریاست کی ایک اہم ذمہ داری یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ اس کے حدود ریاست میں ایک شخص بھی محروم المعیشت نہ رہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس ذمہ داری کی انجام دہی میں اہلِ مملکت میں کوئی امتیاز قائم کرے۔

مذکورہ مباحث سے یہ بات یقیناً ابھر کر سامنے آتی ہے کہ معاشرہ کے کمزور و بے کس،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نادار و معذور افراد کے لیے بیت المال ایک مضبوط سہارا اور بہترین مددگار ثابت ہوتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے کہ بیت المال بلا لحاظ امیر و غریب ہر وقت لوگوں کی پشت پر ایک مددگار کی حیثیت سے موجود رہتا تھا، بیماری و ضعیفی، ناگہانی آفات و مصائب اور عام احتیاج ہر صورت میں یہ دستگیری کرتا تھا۔ اور اس کی موجودگی میں نہ تو بینک ڈپازٹ کی ضرورت پڑتی اور نہ کسی انشورنس پالیسی کی احتیاج ہوتی۔ بہر حال اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیت المال کی بینکنگ سرگرمیاں محض عطایا و وظائف کی تقسیم تک محدود تھیں یا اس سے مقصود ایک ایسے معاشرہ کو پروان چڑھانا تھا جس کے افراد کا گزر بسر بیت المال کے داد و دہش پر موقوف ہو واقعہ یہ ہے کہ اسلام بیت المال کے ذریعہ ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے جن میں لوگوں کو پوری طرح سماجی تحفظ اور فکر فردا سے نجات حاصل ہو اور سب سے اہم یہ کہ انھیں مستقبل کے ممکنہ خطرات سے دفاع کا سامان فراہم ہو، درحقیقت بیت المال وظیفہ خوری یا مفت خوری کو بڑھاوا نہیں دیتا بلکہ معاشی زندگی میں تگ و دو کی ہمت افزائی کرتا ہے اور اس کے لیے لوگوں کو وسائل فراہم کرتا ہے تاکہ وہ اپنے ذرائع معاش کو ترقی دے سکیں مزید براں بیت المال خود اپنے زیر نگرانی بھی زراعت و تجارت اور صنعت و دستکاری جیسے معاشی ذرائع کو فروغ دیتا ہے تاکہ لوگوں کو خوشحالی و فارغ البالی نصیب ہو سکے۔

انفرادی و کاروباری ضروریات کے لیے وسائل کی فراہمی

دور حاضر کی بینکنگ سرگرمیوں میں مختلف مقاصد کے لیے قرض کی صورت میں مالی امداد کی فراہمی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، نجی و کاروباری دونوں قسم کی ضروریات کے لیے موجودہ بینک مالی فنڈ فراہم کرتے ہیں حکومتوں کے اپنے دعوے کے مطابق اس سے مقصود عوام بالخصوص کمزور طبقے کے لوگوں کی معاشی ترقی کا اہتمام ہوتا ہے۔ لیکن یہ بینک اس سہولت کی فراہمی کے عوض سود کی صورت میں اصل رقم سے ایک طرح کی منفعت حاصل کرتے ہیں جس کی شرح قرض کی نوعیت اور مدت ادائیگی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ تاریخی ماخذ کے مطالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ صدر اول کی اسلامی ریاستوں کے تحت بیت المال یہ بینکنگ مشغلہ اس سے بہتر طور پر انجام دیتا تھا وہ نہ تو قرض کی اصل رقم پر کچھ اضافہ کا مطالبہ کرتا تھا اور نہ صارفین کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا یہ اسلام کی بہت بڑی خوبی ہے کہ اس نے اگر سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سودی قرض کا دروازہ بند کیا تو دوسری جانب "قرض حسنہ" کے فضائل و برکات بیان کر کے اس کی ترغیب دی[۳۳] تاکہ آپس میں ایک دوسرے کی قرض کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور اس سے اہم یہ کہ خود حکومت کے ذریعہ اس ضرورت کی تکمیل کا اہتمام کیا گیا اور صدر ریاست کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ وہ بیت المال کے وسائل سے عوام کو یہ سہولت بہم پہونچائے۔ اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں بیت المال کی کارکردگی کے تفصیلی مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقروضوں کی مالی اعانت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص فنڈ سے لوگوں کو بوقت ضرورت قرض بھی فراہم کرتا تھا، عوام و خواص یا حکومت کے متعلقین سبھی اس سہولت سے فیضیاب ہوتے تھے۔[۳۴] بلاذری کے بیان کے مطابق اس وقت والیوں وگورنروں کی جانب سے بیت المال سے قرض حاصل کرنے کا عام دستور تھا[۳۵] بعض جدید اسکالرس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ اپنی تنخواہوں کی ضمانت پر بیت المال سے قرض لیتے تھے[۳۶]، لیکن تاریخی ماخذ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں مل پایا ہے، بہرحال اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ مرکزی وصوبائی دونوں بیت المال سے خواص کے علاوہ عوام کو بھی اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے قرض کی سہولت مہیا ہوتی تھی، مزید براں اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ قرض کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے لیے بیت المال کے افسران قرض لینے والوں سے تحریری وثیقہ جات یا تمسکات حاصل کرتے تھے۔[۳۵]

تجارتی قرض

یہاں یہ ذکر خاص اہمیت کا حامل ہے کہ بیت المال نہ صرف یہ کہ نجی ضروریات کے لیے بطور قرض رقوم فراہم کرتا تھا بلکہ پیداآور اغراض اور کاروباری مقاصد کے لیے بھی قرض کی صورت میں مالی مدد مہیا کرتا تھا، اس ضمن میں خاص طور سے وہ تجارت وزراعت کی ترقی کے لیے لوگوں کو اپنے وسائل سے استفادہ کا موقعہ دیتا تھا اس لیے کہ اس وقت یہی معیشت کے سب سے اہم ذرائع تھے اور انھیں کی توسیع و ترقی میں عوام کی معاشی فلاح و بہبود مضمر تھی بیت المال تجارتی مقاصد کے لیے دو طریقہ سے مالی فنڈ فراہم کرتا تھا، یا تو وہ تاجروں کو عام قرض کی صورت میں رقوم مہیا کرتا اور بغیر کمی بیشی کے اصل رقم ان سے واپس لیتا یا وہ تاجروں کو مضاربت کے اصول پر سرمایہ عطا کرتا اور اصل رقم کے علاوہ باہمی سمجھوتہ کے مطابق ان کے نفع و نقصان میں شریک ہوتا، ماخذ سے دونوں قسم کے قرض کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ بخوبی معلوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ حضرت عمرؓ کا خاص مشغلہ تجارت تھا جو خلافت کے بعد بھی جاری رہا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے ایک بار تجارت کے مقصد سے حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ سے قرض لینا چاہا تو انھوں نے عرض کیا کہ "آپ بیت المال سے کیوں نہیں لے لیتے۔ خلیفہ نے احتیاط کے تقاضا سے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا[۴۶]۔ خلیفہ کے انکار کے باوجود اس روایت سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیت المال سے تجارتی قرض کے حصول کا رواج موجود تھا، مزید براں ابن سعد ہی کی ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت ان کے ذمہ بیت المال کا اسی ہزار درہم قرض واجب الادا تھا[۴۷]۔ ایک خیال یہ ہے کہ خلیفہ نے یہ قرض تجارت کے لیے حاصل کیا تھا۔ بیت المال سے تجارتی قرض کے حصول کا ایک واضح ثبوت ہند بنت عتبہ کے واقعہ سے ملتا ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یہ درخواست کی کہ انھیں بیت المال سے چار ہزار درہم عطا کیے جائیں تاکہ وہ اس کے ذریعہ تجارت کر سکیں انھیں مطلوبہ رقم حاصل ہوئی جسے انھوں نے تجارت میں لگایا لیکن کچھ ایسا اتفاق کہ انھیں اس میں خسارہ ہوا، قرض کی واپسی کے وقت انھوں نے خسارہ کا ذکر کر کے کچھ رعایت چاہی لیکن خلیفہ نے یہ کہہ کر ان سے پوری رقم وصول کی کہ میرا مال ہوتا تو میں کچھ رعایت کرتا لیکن مسلمانوں کے اس مال (بیت المال) میں سے ایک حبہ بھی نہیں چھوڑ سکتا[۴۸]۔ اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے دور میں کوفہ کے بیت المال سے حضرت سعد بن وقاص اور حضرت ولید بن عقبہ کے قرض لینے کی روایتیں بہت مشہور ہیں[۴۹]۔ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرض بھی تجارتی مقصد سے حاصل کیے گئے تھے۔ بیت المال سے تاجروں کو قرض لینے کی جو آسانیاں فراہم تھیں اس کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ وہ ایک بیت المال سے قرض حاصل کر کے کسی دوسرے مقام پر خرید و فروخت کے بعد مقامی بیت المال میں قرض کی رقم واپس کر سکتے تھے، یہ رقم وہاں اس بیت المال کے حساب میں درج ہو جاتی تھی جس سے انھوں نے اصلاً قرض حاصل کیا تھا، اس سے خرید و فروخت کے معاملات اور تجارتی کاروبار میں جو سہولت ہوتی تھی وہ بالکل واضح ہے۔ جہاں تک بیت المال سے مضاربت کے اصول پر سرمایہ کی فراہمی کا سوال ہے اس کی ایک کھلی ہوئی شہادت اس واقعہ سے ملتی ہے کہ عہدِ فاروقی میں ایک بار حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ اور عبید اللہ ابن عمرؓ عراق کی ایک فوجی مہم سے واپس ہو رہے تھے بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعریؓ کچھ رقم مدینہ مرکزی بیت المال کو بھیجنا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ رقم ان دونوں کو یہ کہہ کر بطور قرض دیا کہ وہ راستہ میں اس کے ذریعہ سے تجارت کریں اور مدینہ پہنچ کر اصل رقم بیت المال میں جمع کر دیں، انھوں نے اس رقم کے ذریعہ نفع بخش تجارت کی اور جب خلیفہ کو اصل رقم دینا چاہا تو انھوں نے اسے قرض کے بجائے مضاربت کا معاملہ تسلیم کیا اور ان کے نفع میں سے نصف مال بیت المال کے حق میں وصول کیا[45] اس میں شبہ نہیں کہ گورنر نے یہ رقم مضاربت کے طور پر نہیں فراہم کی تھی لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ اگر یہ معمول بہ نہ ہوتا تو حضرت عمرؓ قطعاً معاملہ کی اس نوعیت کو تسلیم نہ کرتے اور نہ اس کے مطابق اقدام کرتے۔

زرعی قرض

اس دور میں تجارت کے ساتھ ساتھ زراعت کے فروغ سے بھی عوام کی معاشی ترقی وابستہ تھی اسی لیے کسانوں کی فلاح وبہبود اور ان کی خوشحالی کا اہتمام ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک اہم جز تھا۔ تاجروں کے علاوہ ان کی مالی اعانت اور قرض کی صورت میں ان کے لیے وسائل کی فراہمی بیت المال کے دائرۂ کار میں شامل تھی۔ مورخین کے بیانات سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں بیت المال سے کسانوں کو نہایت وسیع پیمانہ پر قرض مہیا ہوتا تھا تاکہ وہ اپنے وسائل زراعت کو ترقی دے کر زراعتی پیداوار بڑھا سکیں یا پھر ان پر کوئی مالی بار ہو تو وہ اسے ہلکا کر سکیں۔ بیت المال کے زراعتی قرض سے لوگ کس حد تک مستفید ہوتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا تھا کہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک (۷۰۵-۷۱۵ء) کے دور میں صرف عراق میں وہاں کے گورنر حجاج بن یوسف کے ذریعہ بیت المال کی جانب سے کسانوں کو تقریباً دو ملین درہم بطور قرض دیے گئے[46] صاحب کتاب الوزراء الجہشیاری پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس السفاح (۷۵۰-۷۵۴ء) کے حالات میں ذکر کرتے ہیں کہ رے کے علاقہ میں ایک شخص ایک بڑی زرعی جائداد کا مالک تھا لیکن اتفاقی طور پر پیداوار کے تلف ہو جانے کی وجہ سے وہ خراج کی ادائیگی کے قابل بھی نہ رہا۔ وزیر ابوعبیداللہ کی ہدایت پر مقامی افسر مالیات نے نہ صرف یہ کہ ایک سال کا خراج اس سے ساقط کر دیا بلکہ اسے بیت المال سے دو لاکھ درہم قرض بھی دیا تاکہ وہ اپنی بحرانی حالت پر قابو پا سکے، یہ قرض دو سال بعد واجب الادا تھا[47] ایک دوسرے عباسی خلیفہ معتضد (۸۹۲-۹۰۲ء) کے بارے میں بعض مآخذ سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ ان کے عہد میں کاشتکاروں کو قرض کی صورت میں مالی مدد مہیا ہوتی تھی تاکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ اس کے ذریعہ بیج اور آلات زراعت کا اہتمام کر سکیں۔[۴۳] مزید براں خلیفہ مقتدر (۹۰۸-۹۳۲) کے وزیر علی بن عیسیٰ کا یہ معمول عام طور پر تاریخی کتب میں مذکور ہے کہ وہ غریب کسانوں کو حکومت کے وسائل سے بیج مہیا کرتے تھے اور فصلوں کی کٹائی کے وقت ان کی وصولی کرتے تھے۔[۴۴] مذکورہ دونوں مثالوں میں گرچہ بیت المال کا ذکر نہیں لیکن قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مالی اعانت بیت المال سے فراہم کی گئی ہوگی۔ یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں کو قرض کی سہولت مہیا کرنے میں بیت المال مسلم وغیر مسلم کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا تھا، اس کے ثبوت میں کتاب الاموال کے حوالہ سے یہ ذکر کافی معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عراق کے گورنر عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو صاف لفظوں میں یہ ہدایت بھیجی تھی کہ وہاں کے بیت المال میں انتظامی امور اور ضروری مصارف کی تکمیل کے بعد جو کچھ بچ رہے اس میں سے غیر مسلم کاشتکاروں کو قرض دیا جائے تاکہ وہ اپنی زراعت کو ترقی دیں۔[۴۵] مذکورہ تفصیلات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ عہد اسلامی میں بیت المال سے تاجروں وکسانوں کو قرض دینے کا عام دستور تھا، گرچہ یہ صراحت نہیں ملتی کہ اس قرض کے لین دین کے کیا اصول وضوابط تھے البتہ بعض حوالوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بیت المال سے یہ قرض کسی نہ کسی قسم کی ضمانت پر ملتا تھا اور اس کی واپسی کی مدت پہلے سے طے شدہ ہوتی تھی۔

پیداآور مقاصد کے لیے جمع شدہ سرمایہ کا استعمال

عوام کی معاشی ترقی کے اہتمام اور ان کی خوش حالی کا سامان فراہم کرنے میں بیت المال کی سرگرمیاں محض قرض کی صورت میں مالی امداد بہم پہونچانے تک محدود نہ تھیں بلکہ یہ خود اپنے وسائل بھی ذرائع معاش کی توسیع وترقی کے لیے براہِ راست استعمال کرتا تھا بیت المال کا اپنے اخراجات سے آبپاشی کا اہتمام کرنا اور اس کے ذرائع کو وسعت دینا اسی ضمن میں آتا ہے۔ زراعت کی ترقی میں آبپاشی کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اسلامی ریاستوں کا شروع ہی سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ نہروں کی تعمیر ومرمت میں بیت المال کے وسائل بالخصوص خراج کی آمدنی صرف کرتی تھیں، خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے زمانہ ہی سے اس کی عملی مثالیں ملتی ہیں۔[۴۶] جن کی تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست کے فلاحی کاموں میں ذرائع آبپاشی کی فراہمی کو ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاص اہمیت حاصل تھی، اس کا ثبوت اس سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کے نام قاضی ابو یوسف کے نصائح ومشوروں میں اس کا خصوصی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ قاضی موصوف خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ صلاح دیتے ہیں کہ اگر اہلِ بصیرت وتجربہ کار اشخاص کی رائے میں کسی علاقہ کی قدیم نہر کی تعمیر سے پیداوار میں اضافہ کا امکان ہو تو علاوہ تو قف بیت المال کے مصارف سے ان نہروں کی مرمت کا اہتمام کریں۔ مزید براں اگر اہلِ سواد کی ان بڑی نہروں کی کھدائی یا صفائی کی ضرورت درپیش ہو جن کا تعلق دجلہ وفرات سے ہے تو اس کام میں جو مصارف بھی ہوں وہ نصفاً نصفاً اہل خراج وبیت المال دونوں پر منقسم ہوں گے، لیکن اگر دجلہ وفرات یا دوسری نہروں و دریاؤں پر پانی جاری ہونے کی جگہ کسی تعمیر کی ضرورت ہو (جس سے آبپاشی کے کام میں آسانی ہو) تو اس کا پورا خرچ بیت المال کے ذمہ ہوگا[۵۳]، مزید براں اس وقت افتادہ وبنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے بھی بیت المال کے وسائل بروئے کار لائے جاتے تھے۔ صدر ریاست یا سربراہِ مملکت کی ذمہ داریوں میں یہ اہتمام بھی شامل تھا کہ "صوافی" یا بیت المال کی مملوکہ آراضی کا کوئی حصہ بیکار نہ پڑا رہے بلکہ اسے قابل کاشت بنا کر آباد کیا جائے یہی وجہ ہے کہ ریاست ان کی آبادکاری کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی تھی اور اس کے لیے جو مختلف طریقے معمول بہ تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ریاست بیت المال کے وسائل سے بیج اور آلاتِ زراعت مہیا کرتی تھی خود اپنی نگرانی میں ان کی کاشت کراتی تھی، خلافت راشدہ اور بعد کے دور میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں[۵۴] اور خود فقہاء کرام نے جس تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اس سے بھی یہی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ بیت المال کے خرچ پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ اپنے اموال واملاک کو پیدا آور مقاصد کے لیے استعمال میں بیت المال کے حد درجہ اہتمام پر یہ امر بھی دال ہے کہ وہ اراضی غیر مورثہ وینامیٰ کی آبادکاری میں بھی گہری دلچسپی رکھتا تھا جو محض عارضی طور پر اس کی نگرانی یا نگہداشت میں رہتی تھیں[۵۵] ان باتوں سے ایک اہم نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس دور کی حکومتیں بیت المال کے باقی ماندہ وسائل کو نفع بخش کاموں یا پیداآور مقاصد کے لیے استعمال کرتی تھیں جیسا کہ موجودہ دور میں بینک اپنے جمع شدہ سرمایہ یا بینکنگ منافع کو صنعت وتجارت یا دوسرے پیداآور کاروبار میں لگاتے ہیں اور اپنی آمدنی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بیت المال کے وسائل کو نفع آور کاروبار میں استعمال کرنا نہ صرف اس کی آمدنی میں اضافہ کا باعث تھا بلکہ یہ عام لوگوں کی معاشی ترقی وخوشحالی کا بھی سبب بنتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کاروباری لین دین اور ارسال زر کے لیے اعتباری تمسکات کا اجرا

عصر حاضر کی اہم و مقبول بینکنگ سرگرمیوں میں چیک اور ڈرافٹ کا اجرا بھی شامل ہے نجی ضروریات، تجارتی کاروبار اور سرکاری کام کاج کے لیے ایک مقام سے دوسرے مقام تک بحفاظت رقوم کی منتقلی اور مقامی طور پر باہمی لین دین میں اس سے جو مدد ملتی ہے وہ بدیہی ہے۔ موجودہ بینکوں کی یہ مصروفیات اتنی عام اور وسیع ہوگئی ہیں کہ آج شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو ان سے فائدہ نہ اٹھاتا ہو یا ان کے دائرہ سے اپنے آپ کو خارج کر سکتا ہو، اس میں شبہ نہیں کہ ارسال زر کے ذرائع اور باہمی لین دین کے طریقوں کی توسیع و ترقی جدید دور کا فیض ہے لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں اس سے انکار مشکل ہے کہ زر نقد کے بجائے "اعتباری تمسکات" کے ذریعہ ادائیگی یا رقوم کی منتقلی کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے جاری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تہذیب و تمدن میں ترقی اور انسانی تحقیق و تجربہ کے مطابق اس کے طریقہ اور اصطلاح میں فرق رونما ہوتا رہا ہے۔ دور دراز مقام تک راستہ کے خطرات سے مامون رہتے ہوئے نقد کو منتقل کرنے یا بھیجنے کا مسئلہ ہر زمانہ میں درپیش رہا ہے، اس کے حل کے لیے موجودہ دور میں بینک ڈرافٹ، چیک، پوسٹل آرڈر و منی آرڈر کے طریقے رائج ہیں۔ قدیم دور میں یہ کام تاجروں اور صرافوں یا انفرادی بنک کاروں کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ اس کی سادہ سی صورت یہ تھی کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شہر میں اپنی کچھ رقم بھیجنا یا منتقل کرنا چاہتا تو وہ کسی مقامی تاجر کے پاس یہ رقم جمع کر دیتا اور وہ تاجر اسے ایک تحریری وثیقہ حوالہ کر دیتا اور اس کے ذریعہ وہ یا اس کا نامزد شخص مطلوبہ شہر میں اس تاجر کے نمائندے یا شریک کار سے وہ رقم وصول کر لیتا۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں اس دعوی میں کوئی تکلف نہیں محسوس ہوتا کہ عرب میں ماقبل اسلام یہ طریقہ رائج تھا اور ظہور اسلام کے بعد بھی اس پر عمل جاری رہا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی بابت روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ وہ مکہ میں مسافروں و تاجروں کی نقد رقوم جمع کر لیتے تھے اور کوفہ یا بصرہ میں (جہاں ان رقوم کی منتقلی مطلوب ہوتی تھی) ان کی ادائیگی کے لیے اپنے شرکاء تجارت یا نمائندوں کے نام خط لکھ دیا کرتے تھے[۵۴] ارسال زر کے اس سادہ طریقہ کو بعد میں اور ترقی دی گئی اور عام تاجروں کے بجائے ان کا ایک مخصوص طبقہ انفرادی بنک کار کی حیثیت سے اس کام میں مصروف ہوا اور یہ طریقہ کچھ اصول و ضوابط کے تحت منضبط ہو کر "سفتجہ" کی خاص اصطلاح سے مشہور ہوا[۵۵]۔ بلاشبہ اُس دور میں سفتجہ (جسے دور جدید کی اصطلاح میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹریولنگ چک، بینک ڈرافٹ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے) کے طریقہ کو قابل عمل بنانے اور اسے رواج دینے میں تاجروں اور صرافوں نے کلیدی رول ادا کیا لیکن اس ضمن میں بیت المال نے جو خدمات انجام دیں انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بخوبی معلوم ہے کہ مرکز کے ساتھ صوبوں میں بھی بیت المال کا نظم قائم تھا، مرکزی و صوبائی بیت المال کے علاوہ خود صوبوں کے بیت المال کے مابین لین دین کے روابط جاری رہتے تھے۔ اس کے لیے بالعموم سفتجہ کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا جیسا کہ معاصر مورخین اور سیاحوں کے بیانات سے واضح ہوتا ہے بیت المال کے مقررہ اصول کے مطابق صوبائی بیت المال کے لیے یہ ضروری ہوتا تھا کہ وہ باقی ماندہ یا فاضل رقوم مرکزی بیت المال کو ارسال کریں۔ گرچہ اس مقصد کے لیے سفتجہ کے استعمال کا ثبوت اموی دور ہی سے ملتا ہے[۵۲] لیکن صوبوں کے مختلف علاقوں سے اس کے صدر مقام اور پھر صوبوں سے مرکز محاصل کی فاضل رقوم بھیجنے کے لیے وسیع پیمانہ پر اس طریقہ پر عمل آوری عباسی دور کی یادگار ہے، اس کے ثبوت میں یہاں چند مثالیں دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صاحب کتاب الوزراء ہلال الصابی کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفہ مقتدر کے ایک وزیر محمد بن عبید اللہ خاقانی اپنی اس کوتاہی کی وجہ سے معزول ہوئے کہ وہ صوبوں سے موصول ہونے والے سفتجہ کے کاغذات پر فوری توجہ نہیں دیتے تھے اور یہ کاغذات کئی کئی روز تک یوں ہی بند پڑے رہتے تھے[۵۳] اسی ماخذ سے مذکورہ وزیر کے جانشین علی بن عیسی کی بابت یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ انھوں نے جہابذ (واحد، جہبذ) یا انفرادی بنک کاروں سے حکومت کو ہر مہینہ بطور قرض دس ہزار دینار فراہم کرنے کے لیے سمجھوتہ کیا اور ضمانت کے طور پر ان سفتجات (Bills of exchange) کو پیش کیا جو صوبوں (کے بیت المال) سے وصول ہوئے تھے لیکن ان کے عوض نقد حاصل کرنے کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی تھی[۵۴] مشہور مورخ و سیاح مسکویہ نے دسویں صدی عیسوی کی ابتدا کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ شہادت دی ہے کہ بغداد کے مرکزی بیت المال میں فارس، اصفہان، اہواز اور دوسرے صوبوں سے محاصل کی کثیر رقوم سفاتج کی صورت میں بھیجی گئی تھیں جو اس وقت وہاں موجود تھیں[۵۵]۔ اس کی مزید وضاحت مسکویہ کے اس بیان سے ملتی ہے کہ ۹۲۵ء میں مرکزی بیت المال نے مصر و شام سے محاصل کی مد میں ایک لاکھ سینتالیس ہزار دینار سفتجہ کے ذریعہ وصول کیے[۵۶]۔ اس کے علاوہ عباسی دور میں صوبوں سے مرکز ارسال رقوم کے لیے سفتجہ کے کثرت استعمال یا رواج پر اس امر سے بھی دلیل فراہم کی جا سکتی ہے کہ صوبوں سے مرکز سفتجہ کے کاغذات بھیجنے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے مخصوص افسر مقرر کیے جاتے تھے جو "فیج" کے نام سے جانے جاتے تھے۔[۵۷] اور سفتجہ سے متعلق امور کی انجام دہی کے لیے مرکزی حکومت یا دربار خلافت کے اپنے بنک کار ہوتے تھے جو "جہابذة الحضرة" کے لقب سے معروف تھے[۵۸]

بیت المال کے بینکنگ اعمال میں زر نقد کے بجائے حوالہ یا چک کی صورت میں ادائیگی کا طریقہ بھی شامل کیا جا سکتا ہے، اگرچہ اس کے استعمال کی مثالیں بہت زیادہ نہیں ملتیں لیکن اس کے قطعی شواہد موجود ہیں کہ عطایا و وظائف اور فوجی مشاہرہ کی ادائیگی کے لیے اموی و عباسی عہد خلافت میں کبھی کبھار یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔[۵۹] آخر میں بیت المال کے ایک اور بینکنگ مشغلہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے حکومت کی جانب سے جاری ہونے والے سکوں کی نگرانی۔ ابتداءً یہ کام محض کھرے و کھوٹے سکوں کی تمیز اور خراب و بیکار سکے الگ کرنے و نیچنے تک محدود تھا۔[۶۰] لیکن ڈاکٹر صالح احمد العلی کی تحقیق کے مطابق بعد میں ریاست کے جملہ سکوں کے ڈھالنے اور ان کے اجراء کی دیکھ بھال بیت المال کے مشاغل کا ایک جز بنا۔[۶۱]

اوپر کے مباحث کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ بیت المال کی سرگرمیاں ریاست کے صرف مالی وسائل کی نگرانی یا دیکھ بھال تک محدود نہ تھیں بلکہ اس کے دائرۂ کار میں خالصتہً بینکنگ نوعیت کے مختلف امور شامل تھے، بلا شبہ اصلاً یہ مسلمانوں کے اجتماعی اموال کے ایک "مخزن یا محفوظ مقام" کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ لیکن اسلامی ریاست کے نظم و نسق میں وسعت اور تہذیبی و ثقافتی اداروں کی ترقی کے ساتھ اس کے مشاغل میں تنوع پیدا ہوا اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ یہاں تک وسیع ہوا کہ معاشرہ کے کمزور و پسماندہ لوگوں کی کفالت کا انتظام، عمومی طور پر سماجی تحفظ (social security) کے حصول کا اہتمام، زراعت و تجارت اور معیشت کے دیگر ذرائع کی توسیع کے لیے مالی وسائل کی فراہمی، پیداآور مقاصد کے لیے جمع شدہ سرمایہ کا استعمال، دور دراز مقامات تک ارسال زر کے محفوظ ذرائع اور زر نقد کے بجائے "اعتباری تمسکات" کی صورت میں ادائیگی کے طریقوں کا فروغ اور سکوں کے اجراء و تبادلہ کی نگرانی جیسے امور بیت المال کی اہم مصروفیات کا حصہ بنے، اسی لیے بعض مستشرقین بھی اس حقیقت کے معترف ہیں کہ یورپ میں بینکنگ نظام کی نشو و نما عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کے یہاں اس نوعیت کے اپنے نظام کی توسیع و ترقی کی مرہون منت ہے۔[۶۲] بینکنگ نظام کی ترقی میں بیت المال کے اثرات سے قطع نظر عوام کی معاشی ترقی کے اہتمام اور ریاست کے فلاحی منصوبوں کو بروئے کار لانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اس نے جو خدمات انجام دیں وہ بھی اپنی جگہ پر مسلم اور کافی اہم ہیں۔

حواشی ومراجع

۱؎ See article on "Bank and Banking" in the New Encyclopaedia Britannica, 15th ed I, P. 793; International Encyclopaedia of Social Sciences. Macmillan Co. 1968, PP. 513-15

۲؎ دیکھئے سنن ابی داؤد، مطبع مجیدی، کانپور ۱۹۲۷ء (کتاب الخراج والفئی والامارہ: باب فیما یلزم الامام من امر الرعیہ والاحتجاب عنہم) ۲/۵۳؛ مسند ابی عوانہ، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۶۲ھ، ۱/۱۳۲؛ اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم الحروف کا مضمون "اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں اور مزید محاصل کا مسئلہ" تحقیقات اسلامی، جلد ۳، شمارہ ۳ (جولائی-ستمبر ۱۹۸۴ء) ص ۶۵-۸۹

۳؎ ابوبکر محمد بن ابی سہل السرخسی، المبسوط، مطبعہ سعادہ، مصر، ۱۳۲۴ھ، ۱۸/۳۰؛ ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مطبع سعادہ، مصر، ۱۹۰۹ء، ص ۱۸۸۔ ۴؎ السرخسی، محولہ بالا، ۱۸/۳

۵؎ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب للہ خمسہ وللرسول؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ۔ بیروت، ۱۹۵۷ء، ۱/۵۰۳، ابوعبید القاسم بن سلام، کتاب الاموال (اردو ترجمہ۔ عبدالرحمٰن طاہر سورتی) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، (بغیر سن طباعت) ۱/۴۱۲، ۵۰۵۔

۶؎ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفئی، ۲/۵۴

۷؎ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف، القاہرہ، ۱۹۶۱ء، ۲/۵۵۴-۵۵۵؛ الماوردی، ص ۱۶۱

۸؎ صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ترک کلًّا او ضیاعًا فالیّ۔ کتاب الاموال ۱/۳۹۹۔ تاریخ الیعقوبی، بیروت، ۱۹۶۰ء۔ ۲/۱۵۳-۱۵۴۔

۹؎ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت ۱۹۵۷ء، ۳/۲۹۵-۳۰۵۔ تاریخ طبری، ۴/۲۰۹-۲۱۲، احمد بن یحییٰ البلاذری، فتوح البلدان، بیروت ۱۹۵۷ء ص ۶۴۵-۶۶۳، کتاب الاموال، ۱/۳۸۷-۴۰۸، ابویوسف کتاب الخراج، القاہرہ، ۱۳۵۲ھ۔ ص ۴۴-۴۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۰؎ کتاب الاموال، ۱/۴۰۹-۴۱۰، البلاذری، ص۶۴۵ نیز حفظ الرحمن سیوہاروی، اسلام کا اقتصادی نظام، دہلی ۱۹۵۱ء ص۱۴۷-۱۴۸

۱۱؎ البلاذری، محولہ بالا، ۱۴۱-۱۴۲، ۶۴۲، نیز دیکھئے ابن سعد ۳/ ۲۹۹

۱۲؎ کتاب الاموال، ۱/۴۰۰-۴۰۱، ۴۱۴-۴۱۵، البلاذری، ص۶۳۴، ۶۴۴، ۶۴۶، ابن سعد ۳/۲۹۸

۱۳؎ ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، بیروت، ۱۹۶۵ء، ۵/ ۶۵، ابن الجوزی، سیرۃ عمر بن عبد العزیز، مصر، ۱۳۳۱ھ، ص۸۹ ۱۴؎ کتاب الاموال، ۱/۴۱۴-۴۱۵

۱۵؎ محمد مظہر الدین صدیقی، اسلام کا معاشی نظریہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۵۵ء، ص۵۲

۱۶؎ محمد نجات اللہ صدیقی، اسلام کا نظام محاصل (اردو ترجمہ کتاب الخراج ابو یوسف) کراچی ۱۹۶۶ء (مقدمہ مترجم) ص۶۶ ۱۷؎ کتاب الخراج ص۱۵۱

۱۸؎ تاریخ طبری، ۴/۹۸-۱۰۰، ابن سعد، ۳/۳۱۰-۳۲۴، ابن الجوزی، سیرۃ عمر بن الخطاب، مصر (بغیر سن طباعت) ص۵۰-۵۱ ۱۹؎ ابن الجوزی، سیرۃ عمر بن الخطاب، ص۵۳

۲۰؎ محمد بن محمد ابو حامد الغزالی، التبر المسبوک فی نصائح الملوک، مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۰۶ھ ص۶۱-۶۲

۲۱؎ ابن جریر الطبری، تفسیر طبری، دار المعارف، القاہرہ (بلا سن طباعت) ۱۴/ ۳۱۸

۲۲؎ البلاذری، ص۶۳۴، الیعقوبی، ۲/ ۱۵۰

۲۳؎ السرخسی، ۳/ ۱۸، الماوردی، ص۱۷۸، ہدایہ اولین مطبع یوسفی، لکھنؤ، ۱۳۲۵ھ کتاب اللقیط، ابن عابدین شامی، رد المحتار علی الدر المختار۔ مطبعہ میمنیہ، مصر، ۱۲۹۹ھ ۳/ ۳۲۴، ۳۲۱

۲۴؎ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص۱۴۴

۲۵؎ کتاب الاموال، ۱/ ۱۶۸، ابو یوسف، کتاب الخراج، ص۱۲۶

۲۶؎ بلاذری، ص۱۷۷، ابو یوسف، کتاب الخراج، ص۱۲۶ کتاب الاموال، ۱/ ۱۶۸-۱۶۹۔ نیز دیکھئے علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء ۲/ ۱۴۳-۱۴۴، ۱۸۱

۲۷؎ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص۱۱۹ ۲۸؎ شامی، رد المحتار (باب المصرف) ۲/ ۶۹-۷۰، ۸۲، ہدایہ اولین، کتاب الزکوٰۃ، باب من یجوز دفع الصدقات الیہ ولا یجوز، ص۱۸۷-۱۸۸

۲۹؎ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص۱۱۹ ۳۰؎ ایضاً، ص۱۷۶-۱۷۷، الفاروق، ص۱۳۸-۱۳۹، ۱۴۴

۳۱؎ دیکھئے مثال کے طور پر قرآن کریم، سورہ الحدید: ۱۱، ۱۸۔ تفصیل کے لیے دیکھئے محمد یوسف الدین اسلام کے معاشی نظریئے۔ حیدر آباد، ۱۹۵۰ء، ص۵۲۲-۵۲۳، ص۴۳۳، ۴۳۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۲ھ تفصیل کے لیے دیکھئے محمد یوسف الدین، اسلام کے معاشی نظریئے، حیدر آباد، ۱۹۵۰ء صـ ۵۲۲
۵۲۳، صـ ۷۳۳ - ۷۳۴

۳۳ھ احمد بن یحیی البلاذری، انساب الاشراف، مکتبۃ المثنیٰ، بغداد، ۵/ ۳۰ - ۳۱

۳۴ھ اسلام کے معاشی نظریئے، محولہ بالا، صـ ۵۲۳، ۷۳۴

۳۵ھ ابو الفرج الاصفہانی، الاغانی، دار الفکر، بیروت، ۱۹۵۶ء، ۱۳/ ۱۹۶ ۳۶ھ ابن سعد، ۳/ ۲۸

۳۷ھ ایضاً، ۳/ ۳۳۸، ۳۵۸، الیعقوبی، محولہ بالا، ۲/ ۱۵۹ ۳۸ھ تاریخ طبری، ۴/ ۲۲۱

۳۹ھ تاریخ طبری، ۴/ ۲۵۱، ابن الاثیر، ۳/ ۸۲ - ۸۳، انساب الاشراف ۵/ ۳۰ - ۳۱ نیز دیکھئے
الدکتور صالح احمد العلی، التنظیمات الاجتماعیہ والاقتصادیہ فی البصرہ، بغداد، ۱۹۵۲ء، صـ ۲۵۳ - ۲۵۴۔

۴۰ھ امام مالک، موطا مع شرح تنویر الحوالک، مصر، ۱۹۶۹ء، الجزء الثانی (کتاب القراض) صـ ۸۸
المدونہ، القاہرہ، ۱۳۲۴ھ، ۳۰/ ۲۵۸۔

۴۱ھ ابن خردادبہ، کتاب المسالک والممالک، مطبع بریل، لیدن، ۱۹۶۷ء، صـ ۱۵

۴۲ھ محمد بن عبدوس الجہشیاری، کتاب الوزراء والکتاب، قاہرہ، ۱۹۳۸ء، صـ ۶۲

۴۳ھ ابو المحسن بن علی التنوخی، نشوار المحاضرۃ، دمشق، ۱۹۳۰ء، ۸/ ۶۶، عبدالعزیز الدوری تاریخ
العراق الاقتصادی، بغداد، ۱۹۴۸ء، صـ ۴

۴۴ھ ہلال الصابی، تحفۃ الامراء فی کتاب الوزراء، دمشق، ۱۹۵۸ء، صـ ۳۳۸

۴۵ھ کتاب الاموال، ۱/ ۴۱۵

۴۶ھ بلاذری، صـ ۳۵۱ - ۳۵۲، ابن عبدالحکیم، فتوح مصر، لیدن، ۱۹۲۰ء صـ ۱۶۳ - ۱۶۶

۴۷ھ ابو یوسف، کتاب الخراج، صـ ۱۰۹ - ۱۱۰

۴۸ھ بلاذری، صـ ۳۸۰ - ۳۸۴، الماوردی، صـ ۱۷۰ - ۱۷۱، یحیٰ بن آدم، کتاب الخراج، القاہرہ، ۱۳۴۶ء
صـ ۶۲ - ۶۳، تفصیل کے لیے دیکھئے ضیاء الدین الریس، الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ، قاہرہ، ۱۹۵۷ء، صـ ۱۴۱

۴۹ھ ابو یوسف، کتاب الخراج، صـ ۱۸۵، محمد بن الحسن الشیبانی، الحجج، لکھنؤ، ۱۸۸۸ء صـ ۲۹۸، الماوردی
صـ ۱۷۱ ۵۰ھ السرخسی، ۱۴/ ۳۷

۵۱ھ اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیں، راقم الحروف کا مضمون " عباسی دور کی انفرادی
بنک کاری پر ایک نظر" تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جلد ۴، شمارہ ۳ (جولائی - ستمبر ۱۹۸۵ء، صـ ۴۷ - ۶۰
نیز خاکسار کا دوسرا مضمون "سفتجہ کی فقہی حیثیت" تحقیقات اسلامی جلد ۳، شمارہ ۲ (اپریل - جون ۸۴ء
صـ ۱۴ - ۳۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۲؎ الجہشیاری، محولہ بالا، صہ ۶۶ ۔ ۵۳؎ الصابی، محولہ بالا، صہ ۲۸۶

۵۴؎ ایضاً، صہ ۹۳ ۔ ۵۵؎ مسکویہ، تجارب الامم، آکسفورڈ، ۲۱-۱۹۲۰ء، ۱/۱۸۷

۵۶؎ ایضاً صہ ۱۴۶ ۔ ۵۷؎ ایضاً صہ ۱۵۰ ۔ ۵۸؎ الصابی صہ ۹۰-۹۱، ۱۷۷

۵۹؎ لسان العرب، ۱۲/۳۳۴، الخوارزمی، مفاتیح العلوم، القاہرہ، ۱۹۳۰ء صہ ۳۸، انساب الاشراف ۱۴۳/۷، یعقوبی، ۲/۱۵۴، مسکویہ، ۳۰/۴۶۱، اغانی ۱۲/۱۹۵-۱۹۶، الجہشیاری، صہ ۱۹۶، الصابی صہ ۷۷-۷۸، ۲۶۴-۲۶۵، ۲۳۵-۲۳۶ نیز دیکھئے الدوری، صہ ۱۷۶-۱۷۹

۶۰؎ تفسیر طبری، مطبعہ میمنیہ، مصر (بلاسن طباعت) ۲۵/۷۲، السرخسی، ۱۴/۸

۶۱؎ دیکھئے صالح احمد العلی، محولہ بالا، صہ ۲۵۵

۶۲؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں، الدکتور صبحی الصالح، النظم الاسلامیہ، نشاتہا وتطورہا۔ بیروت ۱۹۶۸ء، صہ ۳۹۷۔

مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں

امت مسلمہ کی ذمہ داریوں میں عورت اور مرد دونوں شریک ہیں۔ معاشرہ کی تعمیر میں عورت کی بنیادی اہمیت ہے۔ مسلمان خواتین کی دعوتی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں میاں بیوی کے تعاون کی کیا اہمیت ہے؟ دعوتی خواتین کے لیے کیا صفات ضروری ہیں؟ اپنی نوعیت کی مستند کتاب۔

قیمت 3 روپے

عورت اور اسلام

عورت کے بارے میں اسلام کا کیا نقطۂ نظر ہے؟ خاندان میں ماں، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے اس کا کیا مقام ہے؟ علم وعمل کے میدان میں اس نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ کتاب کا ہندی ترجمہ چھپ چکا ہے۔ انگریزی ترجمہ تیار ہے۔

قیمت 3.50

ملنے کا پتہ

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برصغیر میں اشاعتِ اسلام

(علماءِ کرام کی مساعی کا ایک تنقیدی تجزیہ)

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

یہ بڑی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ جس طرح اسلامی فتوحات اور مسلم افواج کی فتح و اقدام کی تاریخ ہمارے مورخوں اور مصنفوں نے دیدہ وری اور دیدہ ریزی کے ساتھ سپردِ قلم کی ہے اس طرح اسلام کی توسیع واشاعت کی تاریخ نگاری پر توجہ نہیں کی گئی۔ خواہ وہ ہمارے قدیم مورخین ہوں یا جدید مصنفین، اس باب میں سبھی کوتاہ قلمی اور تہی دامنی کے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ ہمارے بہت سے مسلم حکمراں جو اپنے کو اسلام کا علمبردار اور امتِ محمدیہ کا پاسبان بناتے نہیں تھکتے بلکہ ان میں سے کچھ تو اشاعتِ دین اور دین پناہی کے بلند بانگ دعوے کرتے نظر آتے ہیں[۱] لیکن ان کی تبلیغی مساعی اور اشاعت دین کی تاریخی اور ٹھوس تفصیلات بہت کم دستیاب ہوتی ہیں۔ ابتدائی مسلم مصنفین عام طور سے اور علمائے کرام اور اسلامی علوم کے ماہرین خاص کر اس کی چنداں فکر نہیں کرتے تھے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں اللہ تعالیٰ کے دین کی توسیع واشاعت کی تاریخ مرتب کریں یا اپنی کتابوں اور رسالوں میں اس کی تفصیلات رقم کریں۔ حیرت وافسوس تو اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم اس تلخ حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی مساعی پر ہمارے مورخین وسیرت نگار اتنی توجہ نہیں کرتے جتنی کہ چاہئے تھی اگرچہ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام آپ کا فرض اولین اور مطمح حیات تھا لیکن آپ کے سوانح نگار اس کے عوامی ردعمل کا ذکر نہیں کرتے جس نے بالآخر امت مسلمہ کی تشکیل کی تھی۔ اس نوع کی تفصیلات خواہ مکی دورِ حیات سے متعلق ہوں یا مدنی عہد رسالت سے آپ کی سوانح کے ضمن میں اکا دکا واقعات کی صورت میں ملتی ہیں اور ان سے آپ کے برپا کئے ہوئے اس عظیم الشان سماجی اور مذہبی انقلاب کی قدم بہ قدم اور عہد بہ عہد تشکیل وتعمیر کا علم نہیں ہوتا جس نے اکھڑ جاہل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور غیر مہذب عربوں کو عظیم ترین تہذیب کا بانی اور آخری خدائی دین کا علمبردار بنا دیا تھا۔[۲] ہندوستان میں قرون وسطیٰ کے مورخین خواہ درباری رہے ہوں یا آزاد قلم کے مالک بالعموم اپنی تاریخی اور قلمی جولانیوں کا محور اپنے وقت کی سرکار دولت مدار کو بنائے ہوئے تھے اور ان کی تمام فکر و نظر ان کے کارناموں کارگذاریوں اور سیاہ کاریوں تک محدود رہتی تھی۔ عام طور سے وہ بادشاہوں اور شہزادوں اور سالاروں کے فوجی اور سیاسی اقدامات کی عکاسی اور تصویر کشی کرتے تھے۔[۳]

ہندوستانی تاریخ نویسی بلکہ مشرقی تاریخ و سیرت نگاری کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بیشتر سیرت و سوانح نگار خواہ وہ دور متوسط کے ہوں یا جدید عہد کے اپنے ذہنی اور فطری رجحان کے لحاظ سے مدلل مداحی کے خوگر ہوتے ہیں سیاسی اور فوجی واقعات سے اگر فرصت ملتی ہے تو کارناموں کی تعریف و توصیف اور ذات و صفات کی تحسین و تزئین میں طبیعت لگتی ہے۔ دوسری طرف ہمارے سیرت نگاروں کو زیادہ تر صوفیائے کرام کے معجزات و کرامات، علمائے عظام کے علمی اور قلمی اکتشافات اور اہلکاران دولت اور سالاران سطوت کے انتظامی اقدامات سے بہت دلچسپی ہوتی ہے۔[۴] اس کے علاوہ ایک بڑا مقبول عام نظریہ اور غلط فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کی توسیع و اشاعت پوری دنیا میں بالعموم اور برصغیر پاک و ہند میں بالخصوص صوفیائے کرام کی کوششوں کی مرہون منت تھی۔[۵] دوسرے مبلغین اور اسلامیین کی مساعی کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا ان کی اہمیت اور قدر و قیمت صفر کے برابر بتائی جاتی ہے۔ ہمارے مصنفوں اور مورخوں کا یہ جانبدارانہ اور یک رخی انداز فکر و نظر اسلام کی اشاعت کے میدان میں دوسرے مبلغوں بالخصوص علماء کی کوششوں کو نگاہ سے اوجھل اور تاریخ کے دھندلکوں میں گم کر دیتا ہے۔ اس مضمون میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلم دانشوروں کے اس اہم طبقہ کی تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے اور تنقید و تبصرہ کی کسوٹی پر ان کو پرکھنے کے بعد جنوبی ایشیا کے اس اہم خطہ میں اسلام کی ترقی و ترویج کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے۔

قرون وسطیٰ کی تاریخیں اور سوانح عمریاں مختلف ادوار کے علماء کے ذکر و بیان پر مشتمل ہیں اور خاصی معلومات فراہم کرتی ہیں جن سے معاشرہ میں ان کے مقام، اثر و رسوخ اور تبلیغی اور مذہبی کردار کا علم ہوتا ہے۔ ان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی مد و جزر اور مسلم سماج کی تعمیر اور شکست و ریخت میں ان کے مثبت اور منفی اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اکبری عہد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء) کے اولین اور اہم ترین مصنفین جیسے حسن نظامی اور صدر الدین عوفی علماء کرام کی مذہبی اور دانشورانہ سرگرمیوں کا بہت کم ذکر کرتے ہیں[۶۶] تاہم قاضی منہاج سراج جو اس عہد کا پہلا باقاعدہ اور حقیقی مورخ ہے ان کی سرگرمیوں کے کئی حوالے دیتا ہے لیکن اس کی توجہ علماء کی سیاسی کوششوں اور کاوشوں پر مرکوز رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سرکاری قاضیوں کی تقرری، تبدیلی اور معزولی سے متعلق واقعات ہی بیان کرتا ہے[۶۷] تیرھویں صدی عیسوی کے دوسرے مصنفوں اور مورخوں کو صرف چند واقعات اور غیر منضبط حقائق بیان کرنے سے دلچسپی تھی اس لئے وہ تبلیغ واشاعت اسلام کے اہم موضوع پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔

بہر کیف ضیاء الدین برنی جسے دہلی سلطنت (۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء) کا عظیم ترین مورخ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے علمائے کرام اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں بالواسطہ طور سے سہی بہت کار آمد اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ وہ سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۸۶ء) کے عہد کے بارے میں لکھتے ہوئے رقم طراز ہے کہ عہد بلبنی میں کم از کم پندرہ عظیم و کبیر علماء کرام ایسے تھے جنھوں نے اسلامی علوم و ثقافت کی ترویج و اشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کیا تھا۔ ان میں سے بیشتر سلطان شمس الدین التتمش کے عہد (۱۲۱۰-۳۶ء) کے علماء کے "فرزندان و نبیرگان و نبیگان" تھے۔ یہ علمائے کرام ایسے تھے جنھوں نے اسلامی فقہ اور اسلامی علوم و فنون میں تعلیم و تعلم کے میدان میں امتیاز حاصل کرنے کے علاوہ دوسرے مختلف میدانوں میں بھی اسلامی ثقافت و تہذیب میں چار چاند لگائے تھے۔[۶۸] مورخ مذکور کے بقول سلطان بلبن علمائے آخرت اور علمائے دنیا یا علمائے سوء کے درمیان فرق و امتیاز پر بڑا زور دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اول الذکر عزت و احترام کے مستحق تھے اور موخر الذکر لعنت و ملامت کے ہدف[۶۹] اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اول الذکر طبقہ ہی نے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کی کوششیں کی تھیں۔ برنی کا بیان ہے کہ عہد اکبری کے متعدد علمائے کرام اور واعظین جلیل بر سر عام اور بر سر خلق مذہبی تقریریں کرتے اور خطبات دینی عطا کرتے تھے۔ ان "مذکران" کے پند و وعظ اور تقریر کو بہت سے لوگ سننے کے لیے آتے تھے اور کبھی کبھی عظیم مذکران کی مجالس وعظ و ارشاد میں سلاطین وقت اور امیران اطراف بھی حاضر ہوتے تھے[۷۰] اگرچہ "قاضیان لشکر" اور دوسرے علمائے انتظامیہ سرکاری عہدہ دار اور حکومتی کارپرداز تھے مگر ان میں سے بیشتر اپنے تقویٰ، علم اور تفقہ کے سبب عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے[۷۱] صرف وہ علمائے سوء جو تھوڑی سی مادی منفعت کے لیے اپنا دین و علم بیچ دیتے تھے اور جو خوش قسمتی سے تھوڑے تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سچ مچ علمائے دنیا تھے اور بجا طور سے عوام کی نفرت اور حکمرانوں کی حقارت کے مستحق تھے۔

اسی طرح خلجی عہد (۱۳۲۰-۱۲۹۰ء) میں بہت سے متقی، متدین اور اہل علم علماء تھے جو اسلام کے علمبردار تھے اور اپنے دین و مذہب کی خاطر گراں قدر خدمات انجام دیتے تھے۔ جلال الدین فیروز خلجی کے عہد (۱۲۹۰-۹۵ء) کے ایک مہم جو اور حوصلہ مند درویش سیدی مولیٰ کے باغی ساتھیوں اور ہمدردوں کو سلطان وقت کی بھڑکائی ہوئی آتش امتحان سے بچانے والے یہی خدا شناس اور عدل گستر علماء تھے۔[12] ہم عصر مورخ کے بیان کے مطابق عہد علاء الدین خلجی (۱۲۹۵-۱۳۱۶ء) کے علماء علوم و فنون اور معارف اسلامی کے تمام میدانوں اور دانشوری اور علمی جہانبانی کے تمام جہانوں کے مردانِ خود آگاہ اور اپنے وقت کے غزالی و رازی تھے بلکہ بعض بعض تو ان اساطین علم و آگہی سے بھی سبقت لے گئے تھے۔[13] سرکاری قضاۃ اور علماء کے علاوہ اس عہد زریں میں مولانا شرف الدین بوشیخی اور ان کے تلامذہ جیسے بہت سے اہلِ علم سادات اور علماء تھے۔ ان کے پہلو بہ پہلو مولانا حمید الدین اور مولانا لطیف تھے جو مولانا مسعود مقری کے فرزندان دلبند تھے مقری اور علم قرات کے استادان جیسے مولانا جمال الدین شاطبی اور مولانا علاء الدین مقری تھے۔ ان تمام علماء نے اسلامی علوم و فنون اور دین کی ترویج و اشاعت میں قابل قدر حصہ لیا تھا۔[14]

لیکن تبلیغ و اشاعت دین کے لحاظ سے سب سے اہم اور گراں قدر حصہ "مذکران وقت" کا تھا جو روزانہ برسرِ خلق اور عام مجالس میں مذہبی اور دینی وعظ و ارشاد کرتے تھے اور اپنے سامعین کے دل و دماغ پر زبردست اثر ڈالتے تھے۔ ان کے خطبات اور "تذکیر" اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عوام دونوں کے دل ہزاروں کی تعداد میں موہ لیتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک بار شیخ نظام الدین اولیاء، قاضی منہاج سراج جوزجانی کی تذکیر و ارشاد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کچھ لمحات کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے اور جب ان کے حواس بحال ہوئے تو قاضی سرکار کی تذکیر ان کے دل کی پہنائیوں میں سرایت کر کے ان کے جسم و روح کے تار تار کو اس طرح اپنی گرفت میں لے چکی تھی کہ تاعمر ان پر اثر قائم رہا اور جب کبھی ان کو قاضی موصوف کی تذکیر یاد آجاتی تو ان کا دل گداز کر جاتی[15]

اس عظیم و جلیل طبقۂ علماء میں مولانا حسام درویش، مولانا عماد، مولانا حمید، مولانا لطیف مقری، مولانا ضیاء الدین سنامی، مولانا شہاب الدین خلیلی، مولانا جلال حسام، مولانا کریم الدین، اور مولانا بدر الدین پنہو کھودی شامل تھے۔ یہ علماء کرام اپنے وقت اور زمانے میں آیات اللہ (اللہ کی نشانیاں) تھے۔[16] برنی آخری خلجی عہد اور ابتدائی تغلق دور (۱۳۱۶-۵۷ء) کے بہت سے دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علماء کا حوالہ دیتا ہے[۱۷] مغربی سیاح ابن بطوطہ محمد تغلق کے عہد (۵۱-۱۳۲۵ء) کے علماء، قضاۃ اور صلحا کا خصوصی ذکر کرتا ہے[۱۸] تغلق عہد کا ایک اور مورخ شمس سراج عفیف متعدد علماء کا ذکر کرتا ہے جو فیروز شاہ تغلق کے عہد (۸۸-۱۳۵۱ء) میں پھلے پھولے تھے[۱۹]

ابتدائی ترک عہد کے ان عظیم علماء کی شاندار خدمات کی توثیق وتائید وقت کے عظیم ترین صوفی شیخ نظام الدین اولیاء کے اپنے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ وہ اس دور کے متعدد علماء اور ان کی خدمات کی تحسین وتعریف کرتے ہیں خواہ وہ ان کے ہم عصر رہے ہوں یا ان کے پیشرو۔[۲۰] ان میں سے ایک فقیہ مادھو تھے جو اجمیر کی شاہی مسجد کے امام تھے اور جنھوں نے ایک اہم صوفی شیخ احمد نہروانی کو قرآن کریم کی تعلیم دی تھی۔ ایک اور عالم مولانا ضیاء الدین تھے جو مذہبی تعلیم وتربیت کے علاوہ تبلیغ وتذکیر کا فریضہ بھی عظیم مینار (قطب مینار) کے زیر سایہ انجام دیتے تھے[۲۱] عظیم چشتی شیخ مولانا شرف الدین کی تلاوت قرآن کے سوز وگداز سے اتنے متاثر تھے کہ وہ روزانہ خاصا طویل سفر کر کے ان کی مسجد میں ان کی امامت میں رات کی نمازیں پڑھنے جایا کرتے تھے[۲۲] اپنے بڑھاپے میں شیخ نظام الدین اولیاء قاضی منہاج سراج اور مولانا عماد الدین سنامی جو ابتدائی ترک عہد کے دو اہم عالم تھے کی تذکیر کو بڑی رقت ومحبت سے یاد کرتے تھے اور اپنے سامعین کے دلوں کو ان کے ذکر خیر سے برماتے تھے۔[۲۳] انھیں کا بیان ہے کہ ملتان کے قاضی قطب الدین کاشانی جو ایک مدرسہ کے سربراہ واستاذ تھے اتنے عظیم ومتقی عالم تھے کہ شیخ بہاء الدین زکریا روزانہ نماز فجر پڑھنے کے لیے ان کی مسجد میں اپنی خانقاہ سے خاصا سفر کر کے جایا کرتے تھے۔[۲۴]

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات پر مبنی خیر المجالس بھی علماء کرام کے بالعموم اور مذکران وقت کے بالخصوص کارناموں کا ذکر کرتی ہے۔ یہ علماء اور مذکران ہزاروں کے دلوں کو گرماتے اور اپنے وعظ وارشاد سے بہت سوں کو راہ راست پر لاتے تھے۔ ان علماء میں مولانا شہاب الدین اوشی بہت نمایاں بزرگ تھے۔[۲۵] سیر الاولیاء[۲۶]، تاریخ مبارک شاہی[۲۷]، مسالک الابصار[۲۸] اور تقریباً دوسرے تمام تاریخی، سوانحی اور مدلل مداحی کے ماخذ خواہ ان کا تعلق ابتدائی ترک دور سے ہو یا مغل عہد سے بے شمار علماء اور ان کی شاندار خدمات اور سرگرمیوں کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام ماخذ ان کی تبلیغی مساعی کے بہت سے حوالے دیتے ہیں تاہم کسی ماخذ میں ان کا واضح ذکر نہیں ملتا۔ بہرکیف یہ بحسن وخوبی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے عام علماء نے بالعموم اور "مذکران وقت" نے بالخصوص یا تو براہ راست تبلیغ کی جو کوششیں کیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے نتیجہ میں لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا یا بالواسطہ اسلام کا پیغامِ الٰہی پھیلا کر بہت سے جویانِ حق کو اسلام سے ہمکنار کیا ہوگا اور نہ جانے کتنوں کے لیے راہِ خداوندی ہموار کی ہوگی۔

بظاہر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ان مآخذ میں سے کئی ایک شاہانِ وقت اور امراءِ سلطنت کے پرزور یا پرامن تبلیغ اسلام کے حوالے دیتے ہیں اور ان میں بعض کے بارے میں یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ظلم و تعدی کے ذریعہ بعض ہندوؤں کو مسلمان بنایا تھا۔[۲۹] لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی ماخذ نے بھی علماء کی تبلیغی مساعی کے ثمرات کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اگر مورخین کے نقطۂ نظر اور مصنفین کے رجحانِ فکر کو دھیان میں رکھا جائے جس کا حوالہ اوپر آ چکا ہے تو یہ حیرت اور بوالعجبی جاتی رہے گی۔ تاریخی کتابیں کبھی کبھی بلکہ شاذ و نادر صوفیائے کرام کے بارے میں یہ بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے بہت سے ہندوؤں کو مسلمان کیا اور تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیا جیسا کہ ابن بطوطہ کے بقول شیخ جلال الدین تبریزی نے بنگال میں بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا تھا۔[۳۰] فوائد الفواد میں ایک بہت دلچسپ اور اہم واقعہ مذکور ہوا ہے جس سے تبلیغ اسلام کے بارے میں صوفیائے کرام بالخصوص عظیم چشتی بزرگوں کے رویہ اور اندازِ فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک بار شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس ان کا ایک مسلمان مرید اپنے ہندو بھائی کو لے کر پہونچا کہ ان کی نظرِ کیمیا اثر سے وہ اسلام کی دولت سے مالامال ہو جائے گا۔ شیخ نے مرید سے دریافت کیا کہ اس کا ہندو بھائی اسلام کی طرف مائل ہے؟ جواب میں مرید نے عرض کیا کہ وہ ان کی خدمت میں اسے اس غرض سے لے کر حاضر ہوا ہے کہ وہ ان کی دعاؤں کی برکت سے مشرف بہ اسلام ہو جائے گا۔ یہ سن کر شیخ پر غم و اندوہ کی کیفیت طاری ہوئی اور انھوں نے بڑی دلسوزی سے فرمایا کہ "یہ قوم تبلیغ یا تفہیم سے اپنے دل نہیں بدلتی۔ البتہ اگر ان کو کسی صالح صحبت میں رہنے کا موقعہ مل جائے تو وہ اسلام سے مشرف ہو سکتے ہیں"۔[۳۱]

یہ واقعہ مدلل مداحوں کی نگارشات اور سیر و سوانح کے بلند بانگ دعووں کے برعکس ہے۔ جن کے مطابق صوفیائے کرام کی نظرِ کیمیا اثر پڑتے ہی بہت سے کافر حلقہ بگوشِ اسلام بن جاتے تھے۔ یہ عجیب بات بلکہ واقعہ ہے کہ صوفیائے کرام کے تمام تذکروں میں ان سے منسوب تمام نومسلموں کی تبدیلی مذہب صوفیہ کی کرامات کا شاخسانہ بتائی جاتی ہے۔[۳۲] یہ بات بڑی اہم اور دلچسپ ہے کہ صوفیائے کرام کے زیرِ اثر تبدیلئ دین کے واقعات میں تبلیغ، تفہیم اور تعلیم کا عنصر نہیں پایا جاتا اور نومسلموں کے ضمن میں دین کی فہم اور اسلامی اصولوں اور عقائد و تعلیمات کی سمجھ کا عنصر غائب ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان بنانے والے نہ تبلیغ کرتے اور نہ تعلیم دیتے ہیں اور مسلمان بننے والے نہ دین کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیقت سمجھتے ہیں اور نہ اسلامی اصول و تعلیمات کو معمول عامل کے روحانی اثر اور ماورائی اور مابعد الطبیعاتی طاقت کے تحت ان کے مذہب کو اختیار کرلیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر خوش خیالی، مدلل مداحی اور انتہائی مبالغہ آمیزی پر مبنی ہے اور اسلام کی تاریخ تبلیغ کے مسلمہ حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ان کے ادنیٰ خادموں اور نام لیواؤں تک تاریخ اسلام کے کسی دور میں اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کشف و کرامات اور معجزات کی رہین منت نہیں رہی۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین عظام کی تبلیغی مساعی میں کامیابی کے ضمن میں کسی معجزہ یا خارق عادت واقعہ کا ہاتھ نہ تھا۔ ان کی تمام کامیابیاں ان کی ان تھک، پرخلوص اور مسلسل جد و جہد، کاوش اور کاہش پر مبنی تھیں۔ پھر اسلام کا دینی مزاج ایسا ہے کہ وہ معجزات و کرامات اور خوارق کا سہارا نہیں لے سکتا۔ وہ سراسر عمل اور جد و جہد کی دعوت دیتا ہے۔ بلکہ قرآن کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ راہ حق معجزات و کرامات کے گورکھ دھندوں سے ہو کر نہیں گزرتی بلکہ وہ تبلیغ تفہیم اور تعلیم کے ذریعہ دوسروں کے سامنے واضح کی جاتی ہے اور جس کو وہ راہ ملتی ہے، فہم، سمجھ اور عقل و فکر کے ذریعہ ملتی ہے۔

اسی بنا پر ایک جدید محقق نے اپنے نظریہ میں ثابت کیا ہے کہ تبلیغ اسلام کا فریضہ بنیادی طور سے صوفیائے کرام کے بنیادی یا ضمنی فرائض میں شامل نہیں تھا۔ ان کا اولین نقطۂ نظر اس دنیا میں اپنی ذات اور روح کا تزکیہ اور آخرت میں نجات تھی۔ وہ دوسروں کی روح کے تزکیہ اور نجات کی اس وقت تک فکر نہیں کرتے تھے جب تک وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی صوفی کا مرید نہ بنالیں اور ان سے نجات و تزکیہ کے طالب نہ ہوں۔ اس نظریہ کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ صوفی ملفوظات میں تبلیغی مساعی کا ذکر بالکل نہیں ملتا جیسا کہ شیخ نظام الدین اولیاء کے مذکورہ بالا واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ بہرکیف اس نکتہ سے یہ ہرگز مراد نہیں لینا چاہئے کہ کسی صوفی نے تبلیغ اسلام کا کام نہیں کیا تھا۔ تاریخ واقعات، مقامی روایات اور سوانحی حکایات بلاشبہ ثابت کرتے ہیں کہ برصغیر کے بعض خطوں میں اسلام کی ترویج و اشاعت بہت سے صوفیائے کرام کی مساعی کی بنا پر ہوئی تھی کیوں کہ یہ صوفیا اسلامی روح سے سرشار اور تبلیغی جذبہ سے معمور تھے اور جب تک مذہب کی گہری محبت اور خلق خدا کی بہبود کا جذبہ دل میں موجود نہ ہو اس وقت تک تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام نہیں دیا جاسکتا اور اس جذبہ کے لیے کسی طبقہ اور فرقہ کی قید نہیں عام مسلمان بھی اس سے آراستہ ہوسکتے ہیں اور وہ اپنی تبلیغی مساعی سے بہتر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثمرات حاصل کرسکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن صوفیائے کرام نے تبلیغ وترویج دین کا فریضہ انجام دیا تھا ان کی مساعی کے پیچھے کارگر اور موثر عامل ان کا تصوف نہیں تھا کہ وہ روشناسیٔ خلق کی بجائے آدم بیزاری اور گوشہ گیری کا باعث ہوتا ہے بلکہ ان کا اصل محرک ان کا دینی جذبہ اور تبلیغی سرشاری تھی جو ان کو مجبور کرتی تھی کہ خلق خدا کو خدا سے روشناس کرائیں[۳۳]۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تبلیغ صوفیائے کرام کے فرائض منصبی میں شامل نہیں تھی تو کیا وہ علمائے کرام کے فرائض بنیادی یا ثانوی میں شامل تھی یا قرون وسطیٰ کے علماء کو اس فرض مہتم بالشان کا شعور وادراک تھا؟ دستیاب تاریخی مواد سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے یا ہمارے مآخذ میں اس موضوع پر مکمل سکوت پایا جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے تمام مصادر ومراجع میں ہمیں ایک بھی مثال نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ تبلیغ دین علماء وقت کے فرائض میں شامل تھی یا علمائے کرام نے اس کو اپنا بنیادی اور اولین فرض سمجھ کر انجام دیا تھا۔ صوفیہ کی مانند علماء نے بھی تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا فریضہ انفرادی طور سے انجام دیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک چھوٹی سی اقلیت نے جو مذہبی جوش سے سرشار تھی یہ کام کیا تھا جبکہ اکثریت اگر مخالف نہ تھی تاہم بے تعلق ضرور تھی۔ ان کا اولین اور آخرین مقصود علم کا حصول اور اس کی نشر واشاعت تھی اور یہ دونوں کام بالخصوص موخر الذکر صرف مسلم طبقات کے دائرہ میں محدود تھے۔ بلاشبہ علمائے کرام نے بہت سے اور طرح طرح کے مذہبی کام کیے اور مختلف میدانوں میں شاندار خدمات انجام دیں لیکن تبلیغ دین کم از کم قرون وسطیٰ کے برصغیر کی حد تک ان کے فرائض اور کاموں میں شامل نہیں دکھائی دیتی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ مسلم دور کا پورا تاریخی اور سوانحی ادب علماء کی تبلیغی مساعی کے ذکر سے خالی ہے البتہ کہیں کہیں چند مثالیں مل جاتی ہیں جو انگلیوں کے پوروں پر گنی جا سکتی ہیں[۳۴]۔ بہرکیف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکران وقت کا طبقہ مستثنیٰ تھا کیوں کہ انھوں نے شعوری کوشش کے ذریعہ غیر مسلموں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنانا چاہا تھا۔ درحقیقت ان کے کام کی نوعیت ایسی تھی جس کے نتیجہ میں ان کو عوام کے مختلف اور گوناگوں طبقات سے تعارف اور تعلقات کے بہتر مواقع حاصل تھے کیونکہ وہ عوامی مقامات پر اپنی تذکیر کی مجالس منعقد کرتے تھے جہاں مسلموں کے ساتھ غیر مسلم بھی استفادہ کرسکتے تھے اور کرتے تھے۔

ایک اور عنصر جو قرون وسطیٰ کے علماء کرام کی تبلیغی مساعی کو پردۂ خفا میں چھپا دیتا ہے، یہ تلخ حقیقت ہے کہ ان کو عموماً صوفیہ سے خلط ملط کردیا جاتا ہے اور خالص علماء اور خالص صوفیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا جاتا۔ عہد متوسط میں یہ ایک مذہبی وطیرہ بن گیا تھا جیسا کہ کسی حد تک آج بھی ہے کہ متقی اور خدا ترس علماء اپنی روح کے تزکیہ اور قیامت میں نجات کی خاطر صوفی روایات اپنا لیتے تھے۔ اکثر وہ صوفی شیوخ کے مرید بن جاتے تھے پھر رفتہ رفتہ خود مسند پیری سنبھال کر شیخ اور صوفی بن جاتے اور اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو بیعت ارشاد سے مشرف کرنے لگتے تھے۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء اپنے معاصر علماء میں سے صرف انھیں کی تعریف و تحسین کرتے تھے جو صوفی اصولوں کی پیروی کرتے تھے یا جن کی زندگی پر تصوف ظاہری کا رنگ چڑھا ہوا نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام علماء صحیح اصطلاحی معنی میں صوفی نہیں تھے بلکہ ان میں سے بیشتر اپنے طبقہ کی روایات کے پابند اور اپنے فرائض منصبی پر عامل تھے۔

درحقیقت صوفی رجحانات کے حامل علماء کرام کو دو واضح اور ممتاز طبقوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے: اول طبقہ ان علماء پر مشتمل تھا اور ہے جو مشاغل علم ترک کر کے مکمل صوفی بن جاتے ہیں اور صوفی آداب و رسوم کو علم کے تقاضوں اور مفادوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان کا محور فکر و عمل ان کی خانقاہیں اور زاویے بن جاتے ہیں جہاں سے وہ دنیا جہان پر صوفی نظر ڈالتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان علماء کا ہوتا ہے جو دونوں کی روایات کا ایک حسین اور معتدل امتزاج پیش کرتے ہیں۔ اسے ہم شریعت و طریقت کا امتزاج اور ہم آہنگی بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی نجات اور تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ اپنے علمی مشاغل اور دینی اور منصبی فرائض سے بھی برابر عہدہ برآ ہوتے رہتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے تمام عظیم چشتی اور سہروردی صوفیائے کرام پہلے طبقہ میں آتے ہیں[۳۵] جبکہ قاضی منہاج سراج، مولانا فخر الدین رازی، قاضی حمید الدین ناگوری، مولانا برہان الدین کاشانی جو عرف عام میں برہان ریزہ کے نام سے مشہور تھے، مولانا شہاب الدین خطیب ہانسوی اور بہت سے دوسرے علماء طبقہ دوم میں شمار ہوتے ہیں اور یہ طبقہ سچے اور کھرے علماء پر مشتمل تھا[۳۶]۔ جدید عہد میں اگر اس طبقاتی تقسیم کا خط کھینچا جائے تو خواجہ حسن نظامی دہلوی، مولانا یعقوب مجددی بھوپالی، مولانا عبدالقادر رائے پوری اور ان جیسے دوسرے علماء کو ترجیحی طور سے صوفیہ کے طبقہ میں شمار کیا جاتا ہے[۳۷]۔ جبکہ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا زکریا کاندھلوی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی بنیادی طور سے علماء کے طبقہ میں گنے جاتے ہیں جو صوفی رجحانات اور متصوفانہ روایات کے حامل ہیں[۳۸]۔

بہر کیف اس خلط طبقہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی تبلیغی مساعی جو صوفیا کے کھاتے میں عموماً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈال دی جاتی ہیں دراصل علماء کرام کی تبلیغی کاوشوں کا ثمرہ تھیں۔ چونکہ قرون وسطی کے علماء کے ضمن میں ہم اس یقین و اذعان کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آیا وہ خالص علماء تھے یا خالص صوفیہ اس لیے یہ الجھن اور بڑھ جاتی ہے اور تاریخی مواد کی کمی کے سبب اس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے خوش قسمتی سے ان دونوں طبقات کے درمیان خط فاصل اور نقطۂ امتیاز کھینچنے کے لیے شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات فوائد الفواد میں مذکور ایک واقعہ مل جاتا ہے اور میرے خیال میں وہ ان دونوں گروہوں کے رجحان، میلان اور ایقان کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔

شیخ جلیل کے مطابق ملتان کے عظیم صوفی شیخ بہاء الدین زکریا اور ان کے معاصر عالم قاضی قطب الدین کاشانی کے درمیان ایک دینی مسئلہ پر اختلاف ہوا۔ اس اختلاف کا لب لباب یہ ہے کہ تمام پہلوؤں میں دین و شریعت کی مکمل تابعداری جس میں احسان و تزکیہ بھی شامل ہے علماء کرام کا طرۂ امتیاز ہے جبکہ طریقت کی ترجیح صوفیہ کرام کا طرز عمل ہے[۳۹]

پروفیسر آرنلڈ اپنی تحقیقات عالیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ طاقت اور سرکاری دباؤ کا حصہ برصغیر میں اشاعت اسلام میں نہ ہونے کے برابر رہا ہے اور درحقیقت جو عناصر کارفرما تھے وہ پرامن مبلغوں کی تعلیمات اور ترغیبات تھیں۔ جو لوگ برضا و رغبت اسلام لاتے تھے وہ ایک ممتاز طبقہ سے متعلق تھے اور وہ زور زبردستی کے ذریعہ مسلمان ہونے والے اشخاص سے نیز مسلم ہند کی تشکیل کرنے والے دوسرے طبقات وعناصر سے یکسر مختلف تھے۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ بیشتر نومسلم اپنی آزاد مرضی سے اسلام کے حلقہ بگوش بنے تھے[۴۰] یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زور زبردستی کے نتیجہ میں مسلمان ہونے والے زیادہ تر عارضی طور سے حلقہ بگوش ہوتے تھے اور وہ سیاسی دباؤ یا فوجی اثرات کے نتیجہ میں مسلمان بنتے تھے۔ ایسے تمام غیر مسلم جو کسی دباؤ کے زیر اثر اسلام کے نام لیوا بنتے تھے موقعہ ملتے ہی اور سرکاری یا فوجی دباؤ ہٹتے ہی اسلام سے روگرداں ہو کر اپنے سابق دین پر لوٹ جاتے تھے[۴۱]

پرامن مبلغین جنھوں نے اس خطۂ ارض میں اسلام کو روشناس خلق کیا تقریباً ایک ہی زمانے میں مغربی اور جنوبی ہند میں وارد ہوئے، بالخصوص سندھ اور مغربی ساحل پر جس کو عرب بالعموم ملیبار کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان مبلغین کے سرخیل عرب اور ہندوستانی نژاد تجار تھے[۴۲] یہ حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام ہندی لوگوں سے بخوبی واقف تھے اور اس حقیقت سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام کے صدر اول ہی میں خدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا دین ہندوستان میں متعارف ہو چکا تھا اور غالباً اس کے اولین مخاطب اور علمبردار برصغیر کے یہی دو خطے تھے[۵۲] خلافت راشدہ کے آغاز ہی میں ہندوستان کے کئی خطے اسلامی فوجوں کی مہم جوئی کا مزا چکھ چکے تھے اور یہ قیاس بعید از حقیقت نہیں کہ بہت سے مبلغین ان فوجوں اور دستوں کے ساتھ اپنے دین و مذہب کی تبلیغ کے لیے ساتھ لگے آئے تھے۔[۵۳] یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عرب سالار اور فوجی اپنے فوجی، سیاسی اور معاشی مقاصد کے ساتھ دینی ذمہ داریوں سے بالعموم کوتاہی نہیں کرتے تھے لہذا تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا فریضہ عام عرب سپاہی اور سالار اپنے قول و عمل سے انجام دیا کرتے تھے۔ بہر کیف یہ بات اب تقریباً مسلمہ حقیقت بن چکی ہے کہ ۷۱۱-۱۲ء کی عرب مہم میں جو محمد بن قاسم ثقفی کی سرکردگی میں وارد ہوئی تھی متعدد مبلغین شامل تھے جنھوں نے سندھ اور مغربی پنجاب کی سرزمین میں اسلام کے بیج کافی دلجمعی سے بو دیے تھے۔ غالباً یہ تمام مبلغین طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے[۵۴] عرب مہموں کی یہ لاشریک خصوصیت ہے کہ ان کے سپاہی اور سالار بالخصوص اور دوسرے سامی علمبرداران دین بالعموم اشاعت و ترویج دین کے جذبے سے سرشار ہوتے تھے اور اسی سرشاری کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ جہاں جہاں جاتے اپنا دین بھی ساتھ لے جاتے اور اس کو مفتوحہ اور محروسہ علاقوں میں بہ استحکام جما دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں عربوں کی حکومت خاطر خواہ مدت تک رہی وہاں کی زبان و ثقافت کے ساتھ ساتھ پوری یا بیشتر آبادی مسلمان بن گئی۔ دوسری جانب غیر عرب فاتحین اور مہاجرین خواہ ترک رہے ہوں یا ایرانی جنھوں نے بعد میں ہندوستان میں مسلم آبادی کا اضافہ کیا تبلیغی جوش و خروش سے تقریباً عاری ہوتے تھے کیونکہ وہ خود اپنے دین و مذہب کی تعلیمات اور اس سے بڑھ کر اس کی روح سے خاطر خواہ بہرہ ور نہ ہوتے تھے[۵۵] بہر کیف سندھ اور اس کے اطراف میں اسلام کی اشاعت کا شرف ان نامعلوم مبلغین کی پرجوش اور مخلصانہ سرگرمیوں کے سر بندھتا ہے جو بلا شبہ مذہبی معلموں اور کارگزاروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

بعد کی صدیوں میں بالخصوص دہلی سلطنت کے زمانۂ زوال و انحطاط میں متعدد مبلغوں کے ناموں کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے سندھ اور ملتان کے علاقوں میں اسلام پھیلایا تھا۔[۵۶] ان میں ایک عظیم عالم سید یوسف الدین نبیرۂ شیخ عبدالقادر جیلانی جو ۱۴۲۲ء میں بغداد سے طول طویل سفر کر کے سندھ پہونچے اور دس سال کی ان تھک تبلیغ اور پرخلوص تعلیم کے بعد لوہانوں کے سات سو مشترکہ خاندانوں کو روشناس اسلام کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پھر ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نومسلموں نے تبلیغ دین کا فریضہ سنبھال لیا اور بعض نے اپنے دوسرے غیر مسلم بھائیوں کو حلقہ بگوش بنایا اور اس طرح اس علاقہ میں مسلم آبادی میں اضافہ کیا۔[۴۸] اس علاقہ سے متعلق ہم کو کچھ خوجہ اور بوہرہ مبلغین کے بارے میں بھی علم ہوتا ہے۔ دو خوجہ مبلغوں یعنی ملا عبداللہ یمنی اور ملا صدرالدین نے بالترتیب گیارہویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں بالائی سندھ کے متعدد گاؤں اور قریوں میں بہت سے لوگوں کو اپنا حلقہ بگوش بنایا تھا۔ جبکہ نورالدین جو عام طور سے نورست ساگر کے نام سے معروف ہیں اور ملا علی نے گیارہویں اور بارہویں صدی میں گجرات میں اپنے دین کی اشاعت کی تھی اور خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔ بلاشبہ یہ تمام مبلغین اسماعیلی فرقہ کے طبقۂ علماء سے متعلق تھے جیسا کہ ان کے خطابات والقاب سے ظاہری طور سے بھی معلوم ہوتا ہے۔[۴۹] پندرہویں صدی عیسوی میں پیرانا کے امام شاہ نے جو ایک اہم مبلغ اور کارگزار تھے کچھ اور گجرات کے علاقوں میں دین کی تبلیغ کی تھی۔[۵۰] یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ گجرات کے طبقہ اشراف وحکمراں کے ایک فرد نے جن کا نام ملک عبداللطیف تھا اور جو سلطان محمود بیگڑہ (۱۴۵۹ - ۱۵۱۱ء) کے ایک امیر کے فرزند تھے علاقہ کچھ کے ہندوں کے درمیان بڑے پیمانے پر اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ اپنے پرخلوص جذبہ، دینی تقدس اور مذہبی سرشاری کے سبب مقامی آبادی میں وہ اول شاہ پیر کے نام سے مشہور تھے۔ اگرچہ ان کی زندگی کی تفصیلات نامعلوم ہیں لیکن ان کی کارگزاری کے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق پڑھے لکھے طبقہ سے تھا اور مذہب کی محبت نے ان کو امارت وسیادت کے لوازم ترک کر کے اشاعت دین کی راہ پر لگا دیا تھا۔ ان کی کارگزاریوں اور سرگرمیوں نے مقامی آبادی کی نگاہ میں ان کو محترم ومعظم بنا دیا تھا جس کا اظہار یوں خطاب والقاب کی شکل میں ہوا تھا۔[۵۱]

جنوبی ہند میں بھی اشاعت وتبلیغ دین کا یہی انداز رفتار وترقی تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس خطے میں اسلام کی روشناسی عرب تاجروں کے ذریعہ عمل میں آئی تھی اور ان میں بلاشبہ متعدد علماء شامل تھے جن کو مقامی اصطلاحات میں "ہنرمند" اور "دانشمند" کہا جاتا ہے۔ موخرالذکر لقب ان مذہبی سرخیلوں کو دیا جاتا تھا جو عرب آبادیوں میں مذہبی فرائض کی ادائیگی میں امارت کے درجہ پر مامور ہوتے تھے اور مسلمانوں کے مذہبی رہنما ہوتے تھے۔[۵۲] یہ کہنا بہرحال ناممکن امر ہے کہ مغربی اور مشرقی ساحلوں پر کس بندۂ خدا نے پہلے پہل اسلام کا پودا لگایا تھا۔ مگر یہ بہرکیف یقینی ہے کہ یہ فریضہ ان عرب تاجروں میں سے کسی خوش قسمت نے انجام دیا تھا جو زمانۂ اسلام سے پہلے ان علاقوں میں سامان تجارت لے کر آیا کرتے تھے۔[۵۳] اب تک کی معلومات کے مطابق کیرالا میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلا مسلمان راجہ بیرومل تھا جو کچھ مدت پہلے تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاصر گردانا جاتا تھا لیکن جدید تحقیقات کا دعویٰ ہے کہ راجہ موصوف اور ان کے اصحاب وامراء نے تقریباً ۲۱۰ھ/۸۲۵ء میں اسلام قبول کیا تھا اور ان کے اسلام کے ذمہ دار وہ مذہبی زائرین تھے جو سیلون سے واپس آرہے تھے۔ راجہ بیرومل اور ان کے ساتھیوں نے خواہ کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہو لیکن خود ان نومسلموں نے اور ان کے ساتھ یا بعد میں عرب سے آنے والے دوسرے مبلغوں نے اس علاقہ میں بڑے پیمانے پر اسلام کی اشاعت کی۔[54] موخرالذکر طبقۂ مبلغین میں حضرت مالک بن دینار، ان کے دس فرزندوں اور نبیروں اور بہت سے دوسرے ساتھیوں نے کڈنگلور اور کالی کٹ کے علاقوں میں کافی اشاعت دین کی تھی۔[55] بلاشبہ یہ تمام مبلغین طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے جیسا کہ ان کے کاموں اور سرگرمیوں سے معلوم ہوتا ہے۔

ابن بطوطہ نے ملابار میں اپنے قیام وسفر کے دوران وہاں کے بہت سے علماء سے ملاقات کی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق یہ علماء اپنی دینی خدمات کی وجہ سے مقامی آبادی کی نگاہ میں بہت محترم تھے۔[56] آرنلڈ نے متعدد مبلغوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سید نثر شاہ (متوفی ۱۰۳۹ء) نے بہت سے ہندوؤں کو بالخصوص ترچناپلی کے راوتن کو مسلمان بنایا تھا۔ ایرادوی کے سید ابراہیم شہید (تقریباً بارہویں صدی عیسوی) اور شاہ الحمید (۱۵۳۲-۱۶۰۰ء) دو اور مبلغ تھے جنھوں نے اس علاقہ میں اشاعت اسلام میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔ دودی کلا طبقہ اپنے قبول اسلام کا سہرا بابا فخرالدین کے موثر تبلیغی کام کے سر باندھتا ہے جو ایک اہم عالم تھے۔[57]

ایک جدید محقق کے مطابق کیرالا میں اشاعت اسلام میں سب سے عظیم کردار پونانی کے مخدوموں اور کالی کٹ کے قاضیوں نے انجام دیا تھا۔ مولانا ابراہیم بن احمد معبری جو کہ چین کے پہلے معروف قاضی تھے ایک اہم عالم اور مبلغ تھے۔ ان کے خلف رشید اور جانشین جلیل ان کے بھتیجے مولانا زین الدین بن علی معبری تھے۔ ان کی پیدائش اور تعلیم وتربیت پونانی میں ہوئی تھی جہاں بعد میں انھوں نے ۱۵۲۲ء میں اپنی وفات تک تبلیغ واشاعت دین کا محاذ گرم رکھا۔ دوسرے علماء کرام میں جنھوں نے اس خطہ میں اسلام کی نشر واشاعت میں زبردست خدمات انجام دیں حسب ذیل حضرات شامل تھے: شیخ عبدالعزیز بن شیخ زین الدین (متوفی ۱۵۸۶ء)، شیخ احمد زین الدین (متوفی ۱۵۸۳ء) جو مشہور کتاب تحفۃ المجاہدین فی اخبار البرتگالیین کے نامور مصنف تھے، قاضی ابوبکر بن محی الدین جو قاضی ابوبکر کہنی کے نام سے معروف تھے (متوفی ۱۸۷۴ء)، ماتن کٹی (متوفی ۱۸۵۵ء)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فضل بن احمد علوی (متوفی ۱۸۹۱ء) احمد کویا جلاتیی (متوفی ۱۹۲۸ء) عبدالقادر فزاری (متوفی ۱۹۴۴ء) اور احمد فرداری (متوفی ۱۹۶۳ء) ان کے علاوہ بہت سے دوسرے علما بھی تھے جو تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ ان بزرگوں میں سے ماتن کٹی کیرالا کے پہلے عالم تھے جنھوں نے ملایالم میں قرآن مجید کا ترجمہ آٹھ ضخیم جلدوں میں کیا تھا۔ جدید عہد میں سی این احمد مولوی (متوفی ۱۹۰۵ء) جیسے علما نے ہندوستان کے اس خطہ میں اسلام کی اشاعت کا زبردست کام کیا ہے[۵۸] اس ضمن میں منت الاسلام سبھا جیسی مذہبی اور تبلیغی انجمنوں کا ذکر بھی کرنا چاہئے جو عظیم تبلیغی اور اشاعتی کام کر رہی ہیں اور جن کی سرخیلی علما کر رہے ہیں[۵۹] تبلیغی انجمنوں کی کارگزاریوں کا ذکر کچھ بعد میں آئے گا کیونکہ ان کی شاندار خدمات تھوڑی تفصیل اور تشریح کی حق دار ہیں۔

دکنی سطح مرتفع اور کورومنڈل ساحل بھی بہت سے پرامن مبلغین کی تبلیغی سرگرمیوں کے عظیم مرکز تھے۔ عرب تاجروں نے اپنے مذہبی رہناؤں کی سرکردگی میں ان علاقوں میں اپنی بستیاں بسائی تھیں۔ ان کے علاوہ مغربی ساحل پر کونکن کا علاقہ بھی مسلمان مبلغین کی سرگرمیوں کا مرکز بنا تھا[۶۰] بے شمار نامعلوم مبلغوں کے علاوہ بیر مہابیر کھنڈایت، سید محمد گیسو دراز، ہاشم گجراتی، شیخ محمد صادق سرمست، خواجہ نذیر حسینی، سید محمد اور سید عمر عیدروس نے بیجاپور، گلبرگہ، پونا، بیدگام، دھنو، دھارواڑ اور ناسک کے متعدد علاقوں میں خدا کا دین اس کی مخلوق تک پہونچایا تھا۔ ان میں سے موخرالذکر تین مبلغین کا تعلق قطعی طور سے علماء کے طبقہ سے تھا[۶۱]

آرنلڈ کا یہ خیال بجا طور پر صحیح ہے کہ "بنگال کے مسلم مبلغوں نے سب سے عظیم کامیابی حاصل کی تھی جہاں تک نومسلموں کی تعداد کا تعلق ہے"[۶۲] جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغربی اور جنوبی خطوں کی مانند بنگال بھی اسلامی دنیا سے قدیم زمانے میں روشناس و مربوط ہوا تھا۔ بہت سے عرب تاجر اور مسلمان مبلغین سمندری راستہ سے اور کورومنڈل ساحل کی جانب سے وہاں پہونچے تھے۔ بنگالی زبان میں بکثرت عربی الفاظ کی موجودگی اور مختلف مقامات پر خلیفہ ہارون الرشید کے سکوں کی دریافت اس واقعہ کی تصدیق تام کرتی ہے[۶۳] علما، صوفیہ اور دوسرے دانشمند و دانشور طبقات نے بنگال میں سکونت اختیار کرنا شروع کر دیا اور تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں دہلی سلطنت کے قیام کے وقت تک وہاں خاصی مسلم آبادی ہو چکی تھی۔ بنگال میں اسلامی حکومت کے قیام نے تبلیغی مساعی کے لیے مزید راہ ہموار کر دی۔ دہلی سلطنت کے علما، اور صوفیہ اور وسطی ایشیا کے منگول ہنگامہ رستخیز میں اکھاڑے ہوئے غیر ملکی علما نے بھی ان دور دراز علاقوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آکر بناہ لی تھی۔ ان تمام مبلغین میں ایک قاضی رکن الدین حنفی سمرقندی تھے جو حنفی فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے۔ انھوں نے ایک علمی مناظرہ میں ایک عالم یوگی بھوجر برہمن کو شکست دے کر مسلمان بنایا تھا۔ یہ بھوجر برہمن اس نئے دین سے سرشار ہو کر ایک عظیم مبلغ ثابت ہوا اور اس نے اپنے سابق ہم دینوں میں سے بکثرت لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔[۶۵] مقامی ہندوؤں اور سادھوؤں اور مسلمان عالموں اور صوفیوں کے درمیان ایسے مناظروں کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں موخرالذکر نے اول الذکر سے دلیل کے میدان میں شکست کھا کر اسلام قبول کیا ہے۔[۶۶] بحث و مباحثہ اور مناظرہ بازی صوفیہ کے طرز عمل اور صلح کل سے میل نہیں کھاتی اس لیے بظاہر یہ خدمت علماء نے انجام دی تھی۔ حریفوں سے مناظرہ قرون وسطیٰ کے علماء کا ایک پسندیدہ مشغلہ تھا اور جدید عہد میں بھی علمی اظہار کا محبوب وسیلہ رہا ہے۔ اس بات کا پختہ قرینہ ہے کہ ۱۲۱۴ء میں راناجیت مل کا قبول اسلام علماء کی کوششوں کا ثمرہ تھا کیونکہ ہمیں اس کے قبول اسلام کے وقت بہت سے علماء اور دانشوروں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی مثال نے متعدد دوسرے لوگوں کو قبول اسلام پر مائل کیا۔[۶۷] شیخ شہاب الدین سہروردی کے ایک عالم خلیفہ شیخ جلال الدین تبریزی (متوفی ۱۲۴۴ء) نے بہت سے بنگالیوں کو روشناس اسلام کیا تھا۔[۶۸]

قدرت کا کارخانۂ اسباب و علل بھی عجیب و غریب نیرنگیاں دکھاتا ہے۔ ۱۸۸۱ء کے لگ بھگ جب بنگال میں مسلم سیاسی اقتدار بالکل تباہ و برباد ہوا تو اس وقت بنگال میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ ۱۸۹۱ء سے ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ شروع ہوا اور تقسیم ہند کی تاریخ تک وہاں مسلمانوں کی ساٹھ فیصد اکثریت ہو چکی تھی جس میں سے زیادہ تر لوگ بنگال کے مشرقی حصہ میں آباد تھے جو پہلے مشرقی پاکستان اور پھر بنگلہ دیش بنا۔[۶۹] بنگال کی مسلم آبادی کی اس غیر معمولی تیز رفتاری اور اکثریت کے پیچھے وہابی تحریک کے مبلغین کی شاندار تبلیغی سرگرمیاں کارفرما تھیں۔ ان کے سرخیل حاجی شریعت اللہ اور ان کے عظیم فرزند دودو میاں تھے جو فرائضی تحریک کے شیر دل رہنما تھے۔ عصر جدید میں ان کے قابل قدر و لائق احترام مریدوں اور جانشینوں نے بنگال میں اسلام کی ترویج و اشاعت میں قابل رشک کردار ادا کیا ہے۔[۷۰]

عام خیال یہ ہے کہ کشمیر میں ترویج و نشر دین کا سارا کام بلبل شاہ، شیخ نورالدین اور سید علی ہمدانی اور ان کے حامیوں اور ماننے والوں نے انجام دیا ہے لیکن یہ حقیقت سب کی نظر سے اوجھل رہی ہے کہ ان میں سے بیشتر کا تعلق طبقۂ علماء سے تھا مثال کے طور پر بلبل شاہ محض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ایسے عظیم معلم اور عالم تھے جو وہاں کے ہندو راجہ کی تلاش حق کی آرزو پوری کر سکتے تھے اور جس کے نتیجہ میں اس نے اسلام قبول کیا تھا۔[۵۹] چودھویں صدی کے اواخر میں سید علی ہمدانی کشمیر میں وارد ہوئے ان کے ساتھ سات سو سید علما، تھے جو ان کے عقیدت مند اور مرید بھی تھے۔ انھوں نے کشمیر کے گوشے گوشے میں اسلامی مرکز قائم کیے اور بڑی کامیابی کے ساتھ دین کی نشر و اشاعت کی۔[۶۰] پندرہویں صدی عیسوی کے خاتمہ کے قریب ایک شیعہ عالم شمس الدین عراقی نے اپنے مادر وطن سے کشمیر آکر وہاں بہت سے لوگوں کو اپنے اصحاب کی مدد سے اپنے مسلک کا حلقہ بگوش بنالیا۔[۶۱] روایات بتاتی ہیں کہ لداخ اور بالٹستان کے علاقوں میں اسلام کا تعارف چار خراسانی بھائیوں کی تبلیغی سرگرمیوں کے سبب ہوا تھا جو اسلام کی محبت و عقیدت سے سرشار تھے۔[۶۲]

عام طور سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ چشتی اور سہروردی سلسلوں کے عظیم صوفیا نے شمالی ہند کے بیشتر علاقوں میں بالعموم اور پنجاب، دوآب اور راجستھان میں بالخصوص اسلام کی نشر و اشاعت کی تھی، اور بہار فردوسی سلسلہ کے زیر اثر تھا جس کے عظیم ترین شیخ شرف الدین یحییٰ منیری تھے شمالی ہند میں نشر و ترویج اسلام کا سارا شرف شیخ ابو الحسن علی ہجویری، شیخ بہاء الدین زکریا اور ان کے عظیم و جلیل جانشینوں اور مریدوں اور شیخ معین الدین سنجری اور ان کے خلفا اجل شیخ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ نظام الدین اولیا اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی اور ان جیسے متعدد دوسرے صوفیوں کو دیا جاتا ہے۔[۶۳] دوسری طرف علما کرام کی تبلیغی مساعی کے بارے میں گوشۂ لب کو بھی جنبش نہیں دی جاتی۔ ان کی تبلیغی مساعی کے بارے میں معلومات اگرچہ کم ہیں تاہم بالکل معدوم نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ شیخ اسماعیل نے جو ایک بخاری سید، عالم دین اور محدث تھے گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں لاہور میں اسلام کی تبلیغ کی اور ان کو بڑی کامیابی ملی۔[۶۴] ان کا طریقہ تبلیغ قرون وسطیٰ کے علما کی تذکیر سے بہت ملتا ہے۔ "ان کے مواعظ حسنہ اور ارشادات عالیہ کو سننے کے لیے جم غفیر دوڑ پڑتا تھا اور ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد روز افزوں ہو رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جو بھی کافر ان کے ربط میں آجاتا تھا وہ اسلام سے محروم نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق تین ہفتوں میں اٹھارہ سو ہندوؤں نے ان کے دست حق پر اسلام قبول کیا تھا۔ شیخ ہر جمعہ کو نماز کے بعد ہفتہ وار تقریر و وعظ کہا کرتے تھے۔"[۶۵] ظاہر ہے کہ ان کے ہاتھ پر کتنوں کو ہدایت ملی ہوگی۔ اگر اس روایت میں مبالغہ بھی مان لیا جائے تو ان کی عظیم کامیابی اور اسلام کی تیز رو ترقی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صوفی نوازوں کا دعویٰ ہے کہ اجمیر میں شیخ معین الدین چشتی نے پہلے پہل اسلام کو روشناس کیا تھا۔ ان کی تبلیغی مساعی سے انکار نہیں لیکن ان پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ دوسرے مبلغ کی خدمات پر سیاہی پھیر دی جاتی ہے[۷۸] ان فراموش کردہ مبلغوں میں ایک سید عالم حسین خنگ سوار تھے جو حسینی مشہدی سید تھے اور شیخ موصوف کے معاصر اور مقامی انتظامیہ کے سربراہ تھے۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں سے مقامی ہندو آبادی اتنی خوفزدہ اور برافروختہ تھی کہ اس نے بالآخر سید موصوف کا کام تمام کر دیا۔ ایک باعمل عالم اور خوش تدبیر منتظم نے اسلام کی راہ میں اپنی جان تک قربان کر دی مگر آج ان کے کارنامہ پر جہالت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں[۷۹]

عصر جدید میں علماء کرام کی تبلیغی مساعی کے بارے میں بیش قیمت اور زیادہ معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے عظیم عالم اور مصلح سید احمد شہید نے ہندوستانی فکر میں ایک انقلابی شعور پیدا کر دیا تھا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ اسلام سے مشرف ہوئے۔ ان کی تبلیغی جدوجہد میں ان کے مریدوں اور شاگردوں بالخصوص مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحیٔ وغیرہ نے مدد کی تھی[۸۰] ایک نامعلوم حاجی محمد کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے ہاتھ پر دو لاکھ ہندوؤں نے پنجاب میں اسلام قبول کیا تھا[۸۱] بنگلور کے ایک مولوی کو یہ فخر تھا کہ انھوں نے پانچ برس کے عرصہ میں شہر اور اس کے اطراف میں ایک ہزار افراد کو مسلمان کیا تھا[۸۲] ایک جاودان بہم رواں مولوی لقا حسین خاں نے کئی برس کی محنت سے دو سوا ڈھائی سو لوگوں کو بمبئی، کانپور، اجمیر اور دوسرے علاقوں میں مسلمان بنایا تھا[۸۳] مولوی حسن علی نے پونا اور حیدرآباد وغیرہ شہروں میں پچیس اشخاص مسلمان کیے تھے[۸۴] نصیر آباد کے قاضی سید صفدر علی نے ضلع خاندیش میں بہت سے کاریگروں کو حلقہ بگوش دین کیا تھا[۸۵] پٹیالہ کے مولوی عبیداللہ نے جو خود بھی ایک نومسلم برہمن تھے اور جید عالم بن گئے تھے بعد میں اپنے بہت سے سابق ہم مذہبوں کو اپنی جانفشانی اور بامردی سے مشرف بہ اسلام کیا تھا[۸۶] شہر بنگلور کے ایک امام مسجد کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے سات آٹھ سال کے عرصہ میں بیالیس کافروں کو خدا کے دین میں داخل کیا تھا[۸۷] عصر جدید کے ایک عظیم عالم اور فلسفہ و فکر شاہ ولی اللّٰہی کے عظیم شارح مولانا عبیداللہ سندھی مولوی عبیداللہ پٹیالوی کی تحریر کردہ ایک کتاب کو پڑھ کر اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے اور بالآخر مسلمان ہو گئے[۸۸] علماء کی تبلیغی مساعی اور اس کے نتیجہ میں اشاعت اسلام کی ایسی بہت سی مثالیں تلاش کر کے پیش کی جا سکتی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے اپنے زمانہ میں تبلیغ واشاعت اسلام کا فریضہ متعدد مسلم انجمنیں اور تنظیمیں انجام دے رہی ہیں۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی قائم کردہ تبلیغی جماعت جس کو ان کے فرزند گرامی مولانا محمد یوسف نے خون جگر دے کر پروان چڑھایا اور متعدد دوسروں نے اسے برقی قوت و رفتار عطا کی اگرچہ بنیادی طور سے ایک اصلاحی تحریک ہے اور اس کا دائرہ کار مسلمانوں کے درمیان اسلام کی نشاۃ ثانیہ تک محدود ہے تاہم اس نے بھی برصغیر اور اس کے باہر تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا بڑا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔[۸۹] دوسری مسلم جماعتیں جنہوں نے تبلیغی سرگرمیوں کے لحاظ سے بڑا کام کیا ہے سنت الاسلام سبھا، جماعت اسلامی، انجمن اشاعت اسلام، انجمن حمایت اسلام، انجمن حامی اسلام اور متعدد دوسری جماعتیں اور تنظیمیں ہیں، جنہوں نے برصغیر کے مختلف علاقوں میں پرامن اور پر وقار تبلیغ کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل قدر اور قابل ذکر ہے کہ ان انجمنوں، تنظیموں اور جماعتوں کی روح رواں علماء کی جماعت ہی ہے۔ ان کی علمی، اصلاحی اور تبلیغی کوششیں اہل علم طبقہ کی مرہون منت ہیں۔[۹۰] جنوبی ہند کے میناکشی پورم اور دوسرے علاقوں میں تبدیلی مذہب کے جدید واقعات جنہوں نے ابھی حال میں پورے ملک میں زبردست شور و غل اور ہنگامہ برپا کر دیا تھا علمائے کرام کی ان تھک، عالمانہ اور حکیمانہ کوششوں کے ثمرات تھے۔[۹۱] قبول اسلام کے بعد تعلیم و تربیت اور استقلال اسلامی کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ جوش میں آکر بہت سے لوگ مسلمان تو ہو جاتے ہیں مگر اسلامی زندگی ان میں پیدا نہیں ہو پاتی ان میں سے کچھ لوگ مرتد بھی ہو جاتے ہیں۔ جماعت اسلامی نے اس اہم مسئلہ کا عملی حل ڈھونڈا اور ملک کے مختلف خطوں میں اسلامی تعلیم و تربیت کے مراکز قائم کیے جہاں نو مسلموں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا نظم ہے۔ مدراس میں ویلور کا مرکز اور کیرالا میں کالی کٹ کے کئی مراکز اس سلسلہ میں بڑا قابل قدر کام کر رہے ہیں۔

مختلف اسلامی علوم و فنون کے مراکز جیسے دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور دارالعلوم ندوۃ العلماء اور فرنگی محل لکھنؤ اور بہت سے دوسرے مشہور اور غیر معروف مدارس بھی مختلف علاقوں میں تبلیغی مساعی کرتے رہے ہیں اگرچہ وہ چھوٹے پیمانہ پر اور محدود طبقہ میں تھیں اور جن کے بارے میں عام معلومات بہت کم ہیں۔[۹۲] میرے اپنے ابتدائی استاد جنہوں نے مجھے قرآن کریم، اردو اور اسلامیات کی تعلیم دی تھی مولانا غلام محمد (۸۳-۱۹۰۰ء) تھے جو تھانہ گولا گوکرن ناتھ کے موضع بلاسپور کے ایک برہمن ہندو تھے اور قبول اسلام سے پہلے کیشو رام شرما کہلاتے تھے۔ ان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مقامی مولوی نے جو صاحب حال بھی تھے اسلام کی طرف مائل کیا اور بالآخر وہ فرنگی محل کے ایک عالم کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے۔ مولانا مرحوم نے مولانا عبید اللہ سندھی کی مانند دار العلوم دیوبند سے علمی فضیلت کی دستار مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا انور شاہ کشمیری جیسے اساتذہ کے ہاتھوں حاصل کی اور بعد میں ہمارے قصبہ گولا میں کافی مذہبی خدمات انجام دیں۔[۹۳]

آج بھی تمام بندشوں اور قدغنوں کے باوجود برصغیر کے مختلف علاقوں میں اسلام کی اشاعت وتبلیغ جاری ہے اور اس عظیم جد وجہد میں علماء کرام ہی پیش پیش ہیں۔ عصر جدید میں تعلیم وسائنس کی ترویج عام کے سبب شعور وادراک کی سطح کافی بلند ہو چکی ہے۔ اب کرامات ومعجزات کی کارفرمائی کا زمانہ ختم ہوا ضعیف الاعتقادی سے گمراہی تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن راہ یابی مشکل سے ملتی ہے۔ یہ دور تعلیم وتفہیم اور تدریس وتشریح کا ہے اسلامی تعلیمات کی موثر تشریح وتفہیم ہی جو یائے حق اذہان وقلوب کا در ذکا مداوا کر سکتی ہے اور کر رہی ہے۔ اور یہ فریضہ صرف اہل علم ہی ادا کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ درحقیقت تبلیغ دین یا ترویج اسلام کا عمل کبھی رک نہیں سکتا۔ یہ وہ سیلاب ہے جو بند باندھنے سے زور پکڑتا ہے اور پھر اسلام کی حقانیت اپنی تاثیر رکھتی ہے جس سے کوئی صاف دل طبیعت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے جو خدائے بزرگ وبرتر کا نازل کیا ہوا ہے تاکہ اس کے بندے نجات سے بہرہ ور ہوں۔[۹۴] اب یہ مسلمانوں کا بالعموم اور عالموں کا بالخصوص فریضہ ہے کہ وہ خالق کا پیغام اس کی مخلوق تک پہونچائیں اور فلاح عام کا فریضہ انجام دیں۔

حواشی اور تعلیقات

۱۔ ملاحظہ ہو شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۹۰ء، ص ۳۸۲-۳۸۲؛ فیروز شاہ، فتوحات فیروز شاہی، مرتبہ شیخ عبد الرشید، علی گڑھ ۱۹۴۹ء، ص ۱۵-۷، درحقیقت تمام قرون وسطیٰ کے حکمراں بشمول اکبر اسلام کے علمبردار اور دین پناہ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے جیسا کہ ان کے خطابات اور سکوں پر کندہ القاب نیز سرکاری تاریخیں اور ان کے فرامین اعلان کرتے ہیں۔

۲۔ ملاحظہ ہو میری کتاب، عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، نقوش رسول نمبر جلد پنجم اور دوازدہم لاہور ۱۹۸۳ء باب دوم بالخصوص جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کی تاریخ بیان کرتا ہے اور جو ابتدائی ماخذ جیسے ابن اسحاق، ابن ہشام، واقدی، ابن سعد، طبری، بلاذری اور متعدد دوسرے تاریخی، مذہبی اور سوانحی ادب میں موجود حوالوں، بیانوں اور نتیجوں پر مبنی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳؎ ہسٹوریننس آف میڈیول انڈیا، مرتبہ محب الحسن خاں، نئی دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۲۳-۱۰۰ اور آئندہ؛ محمد حبیب پالیٹکس اینڈ سوسائٹی ڈیورنگ دی ارلی میڈیول پیریڈ، مرتبہ خلیق احمد نظامی، نئی دہلی ۱۹۸۱ء، جلد دوم، ص ۲۸۶ وغیرہ

۴؎ ملاحظہ ہو محمد حبیب، مذکورہ بالا، نئی دہلی ۱۹۷۴ء، جلد اول ص ۲۵ وغیرہ، ص ۳۸۵ وغیرہ

۵؎ ٹی ڈبلیو آرنلڈ، دی پریچنگ آف اسلام، شرکت قلم لاہور (غیر مورخہ) ص ۹۷-۲۵۷؛ رچرڈ میکسویل ایٹن، صوفیز آف بیجاپور، پرنسٹن یونیورسٹی پریس ۱۹۷۸ء، ص ۱۵۵ وغیرہ؛ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی ۱۹۸۰ء اول ص ۶-۳۵؛ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، فیروز سنز کراچی ۱۹۵۲ء، ص ۶-۸۵ وغیرہ، وحید احمد مسعود، سوانح خواجہ معین الدین چشتی، مسلمان اکیڈمی کراچی، ص ۵-۲۶۲۔

۶؎ حسن نظامی، تاج المآثر، مخطوطہ برٹش میوزیم ۷۶۲۳ (ٹائپ کاپی شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

۷؎ منہاج سراج جوزجانی، طبقات ناصری، کابل ۱۹۶۳ء، اول ص ۵-۶۴، ص ۷۴، ص ۸۳۴ وغیرہ۔

۸؎ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۱۱۱، بہت سے علماء اور ان کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔ ۹؎ برنی، مذکورہ بالا، ص ۵-۱۵۴۔

۱۰؎ برنی ص ۴۲ ۱۱؎ برنی ص ۷۴، ص ۱۰۸ وغیرہ ۱۲؎ برنی ص ۲۱۱ ۱۳؎ برنی ص ۲-۳۶۱

۱۴؎ برنی، ص ۲۴، ص ۴۷، ص ۹۷-۲۸۹، ص ۵۱-۳۴۹، ص ۵-۳۵۴ اور ص ۳۶۴ ۱۵؎ برنی، ص ۷-۳۵۵

۱۶؎ برنی، ص ۴۲۳۔ نیز ملاحظہ ہو حسن سنجری، فوائد الفواد، لاہور ۱۹۶۶ء ص ۳۲۲

۱۷؎ برنی، ص ۸۱-۳۷۹، ص ۴۲۳، ص ۴۲۸، ص ۴۴۱، ص ۴۵۴، ص ۴۹۲، ص ۵۶۴ وغیرہ

۱۸؎ ابن بطوطہ، رحلہ، قاہرہ ۱۹۳۸ء جلد دوم ص ۸-۷، ص ۹-۲۸، ص ۶-۵۴، ص ۲-۶۱، ص ۹۴ وغیرہ

۱۹؎ عفیف، مذکورہ بالا، ص ۵۰-۴۳، ص ۷-۹۶ وغیرہ؛ فتوحات فیروز شاہی، ص ۴، ص ۸-۷ وغیرہ۔

۲۰؎ فوائد الفواد، ص ۲۹ ۲۱؎ ایضاً ص ۱۵۳

۲۲؎ ایضاً، ص ۲۷۵، ص ۳۲۲ اور ص ۶-۱۹۵ بالترتیب۔ نیز ملاحظہ ہوں صفحات ص ۳۸، ص ۵-۴، ص ۶-۱۱۵، ص ۱۶۸، ص ۱۸۷، ص ۷-۳۲۶، ص ۷-۴۰۶، ص ۱۰-۴۰۹۔

۲۳؎ ایضاً ص ۶-۱۹۵، ص ۳۲۲ ۲۴؎ ایضاً ص ۴۰۰-۳۹۹

۲۵؎ حمید قلندر، خیر المجالس، مرتبہ خلیق احمد نظامی، علی گڑھ ۱۹۵۹ء، ص ۵-۶۲، ص ۹-۱۱۸، ص ۱۸۰

۲۶؎ سید محمد بن مبارک کرمانی، سیر الاولیاء، لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۷-۵۵ وغیرہ۔

۲۷؎ یحییٰ سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ ۱۹۳۱ء ص ۲۵، ص ۶-۱۱۵ وغیرہ۔

۲۸؎ شہاب الدین عمری، مسالک الابصار، انگریزی ترجمہ اوٹو اسپیز، علی گڑھ ۱۹۴۳ء ص ۹، ص ۲۴، ص ۳۳، ص ۷-۳۵، ص ۴۸، ص ۵۱ اور ص ۶۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۹۔ برنی، صـ۴۸۳؛ ابن بطوطہ، دوم صـ۶۱-۶۰ - برنی کا بیان ہے کہ کمپلا کے ہندو راجہ کنیا نایک کا ایک رشتہ دار کچھ دنوں بعد مرتد ہوگیا تھا۔

۳۰۔ رحلہ، دوم صـ۱۴۹ ۳۱۔ فوائد الفواد، صـ۳۰۵-۶

۳۲۔ فوائد الفواد، صـ۱۰، ۲۱، صـ۲۲۷-۸؛ خیر المجالس، صـ۵۴، صـ۸۶-۷، صـ۱۹۱-۲، صـ۲۰۸، صـ۲۶۹ وغیرہ؛ غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، نولکشور پریس لکھنؤ (غیر مورخہ) اول صـ۲۵۴، صـ۲۵۸-۶۲ -؛ آب کوثر صـ۲۸۳

۳۳۔ اس نقطہ نظر کی تشریح و تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو اشتیاق احمد ظلی "برصغیر میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ - ایک جائزہ" تحقیقات اسلامی، علی گڑھ ۱۹۸۵ء جلد ۴، شمارہ ۳، صـ۱۹-۴۶ نیز ملاحظہ ہو محمد حبیب، حضرت نظام الدین اولیا۔ حیات و تعلیمات دہلی ۱۹۷۲ء، صـ۱۷۶-۸ جن کا خیال ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ چشتی صوفیا نے کبھی اسلام کی ترویج و تبلیغ کی کوئی کوشش کی تھی۔ ان کے لیے ایسا کرنا دو وجوہ سے ناممکن تھا اول یہ کہ ان کی اصطلاحات، زبان اور روایات صرف تعلیم یافتہ مسلمان ہی سمجھ سکتے تھے، دوم یہ کہ مسلم صوفیہ کا کام صرف مسلم طبقات تک محدود تھا۔ نیز ملاحظہ ہو پروفیسر موصوف کی پالیٹکس اینڈ سوسائٹی اول صـ۳۶۸ وغیرہ۔

۳۴۔ ملاحظہ کیجئے رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند؛ سید عبدالحی، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر حیدرآباد دکن ۱۹۴۷ء، جلد اول تا ہشتم۔

۳۵۔ موازنہ کیجئے، ڈبلو۔ ایچ۔ مسعود، مذکورہ بالا، صـ۲۰-۲۷ وغیرہ؛ محمد حبیب، حضرت نظام الدین اولیا۔ حیات و تعلیمات، صـ۱۰-۲۵، پالیٹکس اینڈ سوسائٹی، اول صـ۲۵۳ وغیرہ؛ تاریخ مشائخ چشت: صوفیا کی تعلیمات کے لیے۔

۳۶۔ فوائد الفواد، صـ۴۴-۵، صـ۳۲۲، صـ۳۲۶-۷، صـ۴۰۹-۱۰؛ خیر المجالس، صـ۶۳-۵

۳۷۔ ملاحظہ ہو امام مرتضیٰ نقوی، خواجہ حسن نظامی - حیات و ادبی خدمات، لکھنؤ ۱۹۷۸ء؛ سید ابوالحسن علی ندوی۔ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، مکتبہ اسلام لکھنؤ (غیر مورخہ)

۳۸۔ عبدالماجد دریابادی، حکیم الامت - نقوش و تاثرات، اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء؛ حسین احمد مدنی، نقش حیات دہلی ۱۹۵۴ء؛ محمد زکریا، آپ بیتی، سہارنپور ۱۳۹۱ھ؛ شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء؛ سید ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء

۳۹۔ فوائد الفواد، صـ۱۸۹-۹۰، کا بیان ہے کہ شیخ بہاء الدین زکریا روزانہ فجر کی نماز پڑھنے قاضی قطب الدین کاشانی کی مسجد میں جایا کرتے تھے۔ ان کا یہ طریقہ ایک حدیث نبوی کی متابعت میں تھا جس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابق ایک متقی عالم کے پیچھے نماز پڑھنا ایسا ہے جیسا کہ نبی کے پیچھے۔ ایک بار قاضی موصوف نے ان سے اتنے طویل سفر کر کے روزانہ زحمت اٹھانے کا سبب پوچھا تو شیخ نے اصل سبب بتا دیا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ شیخ موصوف کو نماز کی دوسری رکعت ملی اور انھوں نے امام کے سلام پھیرنے سے قبل اٹھ کر اپنی فوت شدہ رکعت پوری کرلی۔ جب امام نے یہ پوچھا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا کہ یہ سنت کے خلاف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ امام سے غلطی ہوگئی ہوتی اور وہ سجدہ سہو کرتا۔ شیخ نے جواب میں فرمایا کہ انھیں نور باطن سے معلوم ہوگیا تھا کہ امام سے کسی غلطی کا صدور نہیں ہوا اس لیے انھوں نے سلام سے قبل نماز پوری کرلی۔ اس پر قاضی موصوف نے تبصرہ کیا" ہر وہ نور باطن جو شریعت کا تابع نہ ہو دراصل تاریکی ہے"۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد شیخ موصوف نے قاضی کاشانی کی مسجد میں جانا موقوف کر دیا۔

۴۰؎ آرنلڈ، مذکورہ بالا ص ۵-۲۵۴

۴۱؎ آرنلڈ، ص ۷-۲۵۶؛ برنی، ص ۶-۴۰۶ وغیرہ، ص ۴۸۴؛ بلاذری، فتوح البلدان، قاہرہ ۱۹۷۵ء، ص ۲۷-۲۰۷؛ سید عبدالحی، مذکورہ بالا، جلد اول ص ۳۹، ص ۳-۹۲ وغیرہ؛ نیز آرنلڈ ص ۶۳-۲۵۷ وغیرہ۔

۴۲؎ سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، انگریزی ترجمہ محمد صلاح الدین، حیدرآباد ۱۹۶۲ء، ص ۵۳-۱

۴۳؎۔ ایضاً، ص ۷۔ نیز ملاحظہ ہو ترمذی، سنن، باب الامثال

۴۴؎ سید سلیمان ندوی، ص ۱۱-۸ ۴۵؎ ایضاً ص ۱۴-۱۱

۴۶؎ آرنلڈ، ص ۸-۲۵۷ حاشیہ ۴ سر الفرڈ سی لایل کے تبصرہ کے لیے جوان کی کتاب ایشیاٹک اسٹڈیز لندن ۱۸۸۲ء ص ۲۸۹ سے ماخوذ ہے، سید سلیمان ندوی، ص ۶-۱۰۳

۴۷؎ آرنلڈ ص ۲۷۳۔ ۴۸؎ ایضاً ص ۴-۲۷۳ ۴۹؎ ایضاً ص ۴-۲۷۳ ۵۰؎ ایضاً ص ۲۷۷

۵۱؎ ایضاً ص ۲۷۷ وغیرہ۔ ۵۲؎ سید سلیمان ندوی، ص ۶-۳۴ وغیرہ؛ ص ۵-۱۴۷، ص ۲-۱۵۱ وغیرہ؛ ابن بطوطہ، مذکورہ بالا۔ ۵۳؎ سید سلیمان ندوی، ص ۴-۸

۵۴؎ ایضاً ص ۶-۱۴۵۔ نیز ملاحظہ کیجئے، محمد یوسف کوکن "کیرالا میں اسلام — ایک کل جہتی مطالعہ"، ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا، مرتبہ عماد الحسن آزاد فاروقی، نئی دہلی ۱۹۸۵ء، ص ۹۰-۸۹

۵۵؎ سلیمان ندوی، ص ۷-۱۴۶، کوکن، ص ۹۱-۹۰ ۵۶؎ ابن بطوطہ، مذکورہ بالا

۵۷؎ آرنلڈ، ص ۸-۲۶۷ ۵۸؎ کوکن، ص ۶-۹۱ وغیرہ ۵۹؎ آرنلڈ ص ۲۶۹

۶۰؎ سید سلیمان ندوی، ص ۹-۱۴۷

۶۱؎ آرنلڈ، ص ۲۷۱؛ نزہۃ الخواطر، اول ص ۱۶۴؛ سید سلیمان ندوی، ص ۵۱-۱۵۰

۶۲؎ مذکورہ بالا، ص ۲۷۷۔ نیز ملاحظہ ہو محمد صابر خاں، "بنگال میں اسلام — ایک ہمہ جہتی مطالعہ" ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء، ص ۳-۱۰۲ وغیرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۳؎ محمد صابر خاں، ص ۱۰۵ وغیرہ ؛ عبدالکریم، سوشل ہسٹری آف دی مسلمس آف بنگال (ڈاؤن ٹو ۱۵۳۶ء) ڈھاکہ ۱۹۵۹ء، ص ۵۲-۵۷ جو متعدد علماء کا ذکر کرتے ہیں جیسے مولانا علاء وحید الدین، محمد شاہ، محمد بن یزدان بخش، مولانا حمید دانشمند، اور دیوکوٹ کے مولانا عطاء۔ وغیرہ۔

۶۴؎ محمد صابر خاں، ص ۱۰۵-۶ ۶۵؎ عبدالکریم ص ۶۳-۶ ۶۶؎ آرنلڈ ص ۲۷۸-۸ وغیرہ

۶۷؎ آرنلڈ ص ۲۷۷-۸ ۶۸؎ آرنلڈ ص ۲۸۰ ؛ محمد صابر خاں ص ۱۰۷-۸

۶۹؎ محمد صابر خاں ص ۱۰۵-۹۔ نیز ملاحظہ ہو عبدالکریم ص ۶۶، ص ۸۳ جو متعدد علماء کا ذکر کرتے ہیں جیسے مولانا شرف الدین ابوتوامہ، مولانا تقی الدین العربی، مولانا ابراہیم قوام فاروقی، شاہ محمد صغیر، اور محمد بن یزدان بخش نیز ملاحظہ ہو نزہتہ الخواطر، جلد دوم ص ۱۱۶ جو سیر الاولیا کی سند پر بیان کرتی ہے کہ محمد بن تغلق نے مولانا کریم الدین سمرقندی کو ستگاؤں کا شیخ الاسلام بنا کر بھیجا تھا اور انھوں نے وہاں اشاعت اسلام میں کافی حصہ لیا تھا۔

۷۰؎ مرے بی ٹیٹس، انڈین اسلام، نئی دہلی ۱۹۷۹ء، ص ۴۹

۷۱؎ آرنلڈ، ص ۲۹۲ ؛ نیز ملاحظہ ہو جی ایم ڈی صوفی، اسلامک کلچر ان کشمیر، نئی دہلی ۱۹۷۹ء، ص ۳۴ جن کا خیال ہے کہ شیخ کا اصل نام سید شرف الدین یا سید عبدالرحمٰن شرف الدین تھا اور وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید و خلیفہ تھے۔

۷۲؎ آرنلڈ ص ۲۹۲ ؛ صوفی ص ۴۵-۴۲۔ موخر الذکر کا بیان ہے کہ ان سادات کرام نے تبلیغ دین کا کافی اہم کام کیا تھا۔ سید علی ہمدانی، ان کے اصحاب و خلفاء اور مریدین کے سوانحی خاکے ان کو طبقہ علماء کے افراد بتاتے ہیں۔

۷۳؎ آرنلڈ ص ۲۹۲ ؛ صوفی ص ۴۶-۷ ۷۴؎ آرنلڈ ص ۲۹۳ ۷۵؎ ایضاً ص ۲۸۱ وغیرہ

۷۶؎ ایضاً ص ۲۸۰-۱ ۷۷؎ سید عابد علی وجدی الحسینی، ہندوستان اسلام کے سائے میں، بھوپال ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۷-۸ نے بروایت حدائق الحنفیہ ص ۲۲۲ اور قاضی اطہر مبارکپوری کی رجال الہند والسند ص ۲۶۷ کے حوالہ سے بیان کی ہے

۷۸؎ ڈبلو ایچ مسعود، ص ۲۶۲-۷۵ ؛ اشتیاق احمد ظلی، ص ۱۹-۲۵

۷۹؎ نزہتہ الخواطر، اول ص ۱۴۲

۸۰؎ سید ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، لکھنؤ ۱۳۶۸ھ اول ص ۱۳۸-۴۰ وغیرہ ص ۱۵۵-۶، ص ۲۲۲-۳

۸۱-۹۰؎ آرنلڈ ص ۲۸۲-۶ وغیرہ

۹۱؎ برجیندر ناتھ بنرجی، ریلجس کنورشنز، نئی دہلی ۱۹۸۲ء، مقدمہ ص ۷-۸، تبدیلی مذہب کے ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہریجن کے لیے تبدیلی مذہب کا انتخاب صرف اسلام بن گیا ہے۔ لہٰذا ہندوؤں نے اس پر ہنگامہ برپا کرنا شروع کر دیا ہے۔ تامل ناڈو میں اسلام لانے کے نئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقعات نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا ہے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۰ء کے پینتیس سال کے عرصہ میں پندرہ سو تبدیلی مذہب کے واقعات ہوئے جن میں ہریجنوں نے اسلام قبول کیا۔ لیکن فروری ۱۹۸۰ء کے بعد اس میں اچانک اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ انیس ماہ میں صرف تامل ناڈو میں دو ہزار پانچ سو اٹھانوے ہریجنوں اور عیسائیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔"

۹۲۔ ان اسلامی مراکز پر کتابیں ملاحظہ ہوں۔ نیز ملاحظہ ہو ضیاء الدین احمد ڈیسائی، سنٹرز آف اسلامک لرننگ ان انڈیا۔ نئی دہلی ۱۹۷۸ء، ص ۹۴-۵

۹۳۔ مولانا غلام محمد، روداد زندگی، مخطوطہ جو راقم سطور کے پاس ہے اور جلد ہی حواشی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوگا۔ مولانا مرحوم کا مختصر تعارف یوں ہے کہ اسلام سے قبل ان کا نام پنڈت کیشو رام شرما تھا۔ ان کے والد کا نام امراؤ لال شرما تھا اور وہ قصبہ اور تھانہ گولا کو کرن ناتھ ضلع لکھیم پور کھیری کے ایک گاؤں بلاسپور کے باسی تھے ان کے آباؤ اجداد کا تعلق ضلع ہردوئی سے تھا اور مختلف مقامات پر سکونت اختیار کرتے ہوئے اس گاؤں میں مستقل طور سے آبسے تھے۔ عنفوان شباب میں مولانا مرحوم کو گاؤں کے ایک مولوی بندہ حسن خاں جو صوفی تھے اسلام کی طرف مائل کیا۔ اور بالآخر جون ۱۹۱۶ء میں وہ مولوی عبدالحی فرنگی محلی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

۹۴۔ بی۔ این۔ بنرجی۔ مذکورہ بالا۔

© rasailojaraid.com